امام
زین العابدین
علی بن حسینؑ

باراوّل ۱۹۶۱ء

ناشر: رشید احمد چودھری

طابع: استقلال پریس، لاہور

امام زین العابدین

علی بن الحسین

تصنیف: عبدالعزیز سید الاھل
ترجمہ: عبدالصمد صارم الازہری

مکتبہ جدید لاہور

پیش لفظ

بہت ممکن ہے ، کچھ لوگ میری اس کتاب کو پڑھے بغیر ہی کہدیں کہ یہ ایک خاص گروہ کے مکتبِ خیال کی ترجمان ہے ، ایسے لوگ اس کتاب سے کوئی دلچسپی نہ لیں گے ، لیکن اُن کا یہ فیصلہ کتاب کے صرف سرورق اور عنوان کی حد تک مطالعہ پر مبنی ہوگا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں مَیں کیا رائے دے سکتا ہوں ، اور میں ہی کیا غالباً کوئی بھی اس پر قادر نہ ہو ، بھلا یہ بھی کوئی فیصلہ ہوا جس میں نادانی کو دانائی پر ترجیح دی جائے ، یا بے انصافی کو ہٹ دھرمی سے منوانے کی کوشش کی جائے۔ اور کسی معاملہ کو جانچے اور پرکھے بغیر اس کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا جائے۔

اس کے برخلاف انصاف پسند طبائع والے اس کتاب کا مطالعہ کریں گے تو فرقہ بندی اور گروہ پرستی کے اختلافات کے باوجود اس کو اپنی مَن پسند کتاب پائیں گے۔ میں اس میں ایک ایسے شخص کی شاہکار زندگی پیش کر رہا ہوں جو لوگوں کا مقتدا ہونے سے پیشتر ان کے لیے انسانیت کا پیکر تھا۔ شاید نوجوان طبقہ اس سیرت اور اس شاہکار سوانح کو پڑھ کر انصاف سے کام لیتے ہوئے میری اس قلمی کاوش کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھے۔ میں نے اس سوانح میں مختلف مورخوں کے ہاتھوں سے چنیں کردہ انمول نوادر جمع کر دیئے ہیں جو ایک بطلِ عظیم اور محبوبِ رہنما کی سیرت

کے لیے شایانِ شان تھے۔ ناظرین اس سوانح میں ایک مردِ حق آگاہ اور بلند ترین انسان کی وہ مکمل ترین تصویر دیکھیں گے جسے وہ آج تلاش کرتے ہیں تو سوائے حلقۂ دامِ خیال کے کوئی چیز ان کے ہاتھ نہیں آتی۔

حضرت زین العابدین علی بن حسین سجادؑ ایک معروف ہستی ہیں۔ وہ چنداں میری قلمی نگارش کے ذریعہ محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ کے ماننے والے مجھ سے زیادہ جانتے ہوں گے لیکن میرے قلم، کاغذ اور روشنائی نے مجھے مجبور کیا کہ اس عالی مقام رہنما کی مجد و شرف سے بھرپور زندگی کے حالات سے کاغذ و قلم کی زیبائش کا سامان فراہم کروں۔ اس سرمایۂ عقیدت کے ساتھ میں اس بطلِ جلیل کی سیرت کو ایک نئے ڈھنگ سے پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ وہ عصری رجحانات رکھنے والوں کو پسندِ خاطر ہوگی، یہ اگر کوئی رشک کا مقام ہے تو یقیناً میرا قلم جو علی بن حسینؑ کی سیرت پیش کر رہا ہے اس کا مستحق ہے کہ شرف و بلندی کا سرمایہ فراہم کرتے ہوئے دوسرے بہت سے قلموں کے سامنے سرِ افتخار اونچا کرے۔

مجھے شروع میں خیال ہوا کہ میں اپنی اس پیشکش میں بعض لوگوں اور بعض مورخین کے وہ خیالات پیش کروں جو وہ حضرت علی بن حسینؑ اور ان کے والد حضرت حسینؑ کے متعلق رکھتے ہیں تو میں نے بہت سے صاحب الرائے مورخوں کو پایا جو حضرت حسینؑ کو اس لیے ملامت کرتے ہیں کہ انھوں نے خواہ مخواہ بہادری کا مظاہرہ کیا اور شہید ہوئے۔ ان لوگوں کے خیال میں گویا زیادہ صحیح یہ تھا کہ حضرت حسینؑ کو اپنے راست اقدام کرنے اور خود کو شہادت گاہِ حق میں پیش کرنے سے اجتناب کرنا

چاہیئے تھا تاکہ وہ شہید نہ ہوتے۔ اس قسم کے لوگ سوالیہ نشان بن کر رہ گئے کہ آخر حسین نے خود کو قتل ہونے کے لیئے کیوں پیش کر دیا؟

لیکن میں پھر ان ہی لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ یہ لوگ علی بن حسین کو اس لئے ملامت کر رہے ہیں کہ انھوں نے واقعہ حرہ میں کیوں جہاد نہ کیا؟ گویا یہاں ان کی صوابدید یہ ہے کہ علی کو موت کی طرف بڑھتے ہوئے قتل ہو جانا چاہیئے تھا۔ یہاں ان کے سوال کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہے کہ زین العابدین نے خود کو قتل ہو جانے کے لیئے کیوں نہیں پیش کیا؟

ان دونوں سوالوں کے درمیان، دل پریشان ہے اور عقل سر پٹکتی ہے، نہ طبیعت دل پر قابو پاتی ہے کہ اسے سمجھا سکے اور نہ عقل کے بس کا یہ روگ ہے کہ وہ کچھ سوچے اور جواب دے!

حضرت علی بن حسینؓ کی سیرت ایک مقدس سیرت ہے جس میں آپ کو ایک خاموش تحریک، یا بالفاظ دیگر ایک سراپا تحریک، خاموشی کے ساتھ چلتی ہوئی نظر آئے گی۔ قاری کو اس تحریک کی نہایت موثر صورتوں میں سے ایک ایسی بلند صورت نظر آئے گی جس سے ہم صرف دور حاضر میں روشناس ہوئے اور جس کو ہم یہی سمجھتے ہیں کہ وہ صرف ہمارے زمانہ کی ایجاد ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہماری قدیم عربی قوم کی روایات میں سے ہے۔ جس سے دوسرے بعد میں متعارف ہوئے۔

میں نے جس وقت واقعات پر قلم اٹھایا محسوس ہوتا تھا کہ گویا میں ایک بحرِ مواج میں غلطاں و پیچاں ہوں۔ پیر تک بھی مجھے اس سمندر کے کنارے نظر

آتے تھے۔ بہر حال میں نے جدوجہد سے کام لیا اور کامیابی کے ساتھ کنارے تک پہنچ گیا۔ میں کوئی واقعہ کسی کتاب سے نقل کرتا اور اس کو نا تمام وہیں قطع کرتا اور اس کا سراغ دوسری کتابوں میں لگاتے ہوئے اس واقعہ کو وہاں سے مکمل کرتا۔ اسی طرح اجزاء کو باہم ربط دیتا اور صیقل کرتا ہوا آخر تک پہنچا۔ میری کوشش یہی رہی کہ نہ حقیقت کو پھلانگ کر آگے نکلوں اور نہ کسی تاریخی مغالطہ میں مبتلا ہوں۔ اور نہ کسی خوبی کو بڑھاؤں چڑھاؤں۔ تاہم جس وقت میں نے کتاب مکمل کی تو میرا تخیل یہ تھا کہ میں نے کوئی خاص کارنامہ انجام نہیں دیا بجز اس کے کہ کچھ واقعات کی کڑیاں ملا دیں اور کچھ الفاظ میں ربط قائم کر دیا۔ بہت ممکن ہے کوئی شخص جو میرے ساتھ نہیں تیرا بلکہ کنارے ہی پر کھڑا دیکھتا رہا اور تیرنے کو ایک معمولی کارنامہ سمجھتا رہا وہ خیال کرے کہ میں نے کوئی مشکل کارنامہ انجام نہیں دیا۔

اس کے علاوہ ایک دوسری چیز بھی ہے جس کا میں نے اہتمام کیا ہے یعنی واقعات کو ایسے آسان پیرایہ میں پیش کیا ہے کہ بغیر کسی ذہنی کاوش و تکلف کے خوب سمجھ میں آجائیں۔ نامانوس الفاظ، درایت و فکر سے ہٹی ہوئی باتیں اور حیران کن اشتباہات سے یکسر اجتناب کیا ہے تاکہ کتاب دردسری کا سامان ہو کر نہ رہ جائے۔

ان واقعات کی تاثیر قاری کے ذہن و فکر پر کیا ہو گی؟ مجھے معلوم نہیں! کہ وہ بھی میری طرح روئے گا، اس کے جذبات بھی اسی طرح متاثر ہوں گے جس طرح ان واقعات کے لکھتے ہوئے اور پڑھتے ہوئے مجھ پر تاثر کی کیفیت طاری ہوئی۔ یا وہ ان واقعات کے سامنے گم سم ہو کر رہ جائے گا کہ نہ کوئی آنسو نکلے گا نہ تاثر ہو گا؟ ڈر مجھے بھی یہی ہے کہ کہیں موخر الذکر صورت پیدا نہ ہو جائے تاہم

میں خیال کرتا ہوں کہ صاحب شعور صرف میں ہی نہیں ہوں اور بھی لوگ دنیا میں شعور رکھتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ایک عظیم انسان سے متاثر ہونے والوں میں ایک میں ہی تنہا نہ ہوں گا کیونکہ وہ زین العابدین جس نے آج سے پیشتر اپنے دور میں لوگوں کے جگر پانی کر دیئے وہ آج کے دور میں ہی نہیں بلکہ قیامت تک کے آنے والے انسانوں کے جگر کا لہو گرما سکتا ہے!

زین العابدین صرف عرب اور فارس کے درمیان ہی ایک طاقتور رابطہ کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ وہ تمام انسانوں کے لیئے یہی حیثیت رکھتے ہیں۔ گویا آپ کی ذات گرامی ایک موثر و قوی سبب ہے جو اپنے جلو میں لطیف قدروں کو اس طرح اٹھائے ہوئے ہے کہ فرقہ پرستی مٹ جائے۔ لوگوں کے دلوں میں یگانگت پیدا ہو اور الفت کا غلبہ ہو۔

کیا آپ کے لیئے یہ کچھ کم فخریہ کارنامہ ہے کہ آپ کے پاس ایک ایسا مضبوط ہاتھ تھا جو انسانوں کو غلامی سے نجات دلانے میں اور اپنی کمائی اس آزادی پر شب و روز خرچ کرنے میں پیہم سرگرم عمل تھا۔ راویوں کا بیان ہے کہ موصوف نے ایک لاکھ غلام اور کنیزیں آزاد کیں۔ اگرچہ یہ مبالغہ بھی ہو اور واقعہ ایک ہزار یا سو یا دس ہی تک پہنچتا ہو تب بھی دنیائے انسانیت میں ایک بڑے انقلاب کی خبر دیتا ہے۔ اگر فرزدق تمام عمر اس واقعہ پر فخر کرتا رہا کہ اس کے دادا نے دورِ جاہلیت میں تین سو زندہ درگور کی جانے والی لڑکیوں کی جانیں بچائی تھیں تو زین العابدین کے لیئے اس سے بڑھ کر مقام فخر ہے کہ اس کے عزائم تمام دنیا کے غلاموں کی زنجیریں کاٹ کر پھینک دینا چاہتے تھے۔ غلامی یقیناً قتل اور زندہ درگور کیے

جانے سے بھی زیادہ شدید ترین قباحت ہے!

بہرحال یہ مبتدا ہے جس کی خبر آگے آتی ہے اور اشارہ ہے جس کے ذیل میں تفصیل ہے۔ امید ہے کہ حضرت سجاد زین العابدین کے طفیل، خدا میرے نامۂ اعمال میں اپنے فضل سے کوئی نیکی لکھ دے اور قاری اور بنظرِ انصاف مطالعہ کرنے والوں کو بھی اپنے کرم و فضل سے محروم نہ رکھے۔

عبدالعزیز سید الاہل

عرب و عجم

عرب فوجیں فارس کے قلعوں کی اینٹ سے اینٹ بجا رہی تھیں اور خود فارس کے عوام بھی ان قلعوں کی شکست و ریخت میں عرب بہادروں کے مددگار بن گئے تھے، وجہ یہ تھی کہ شاہ کسریٰ ملک، انی اور قوم و رعایا کے حالات کو سنبھالنے میں بالکل نکما ثابت ہو چکا تھا۔ عوام زرد شتی عقیدے کے حامل تھے اور خیر و شر کے دو خداؤں کی پرستش کرتے تھے۔ تمام بطلیا اپنی زبوں حالی کو دیکھ کر یہ سمجھنے پر مجبور تھی کہ خیر کے خدا نے ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ وہ ہر طرح سے ہم پر غالب و منصور ہو چکا ہے اور ہم سب کو اس نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیا ہے۔

شاہی قلعہ میں ہر فرد پر خرمستیاں سوار تھیں، شاہی انتظامات میں سب سے زیادہ جس مسئلہ کو اہمیت تھی وہ شاہی دسترخوان کا نظم تھا۔ اس کے لئے خود بادشاہ نے ضوابط مقرر کر کے رنگ برنگ کے لذیذ کھانے اور سونے چاندی کے جام و مینا میں بادۂ پر کیف کا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ درباری امراء میں اسراف عام تھا۔ وہ بھی اپنی اپنی جگہ شاہی عیاشی کی تقلید کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مقابلہ کر رہے تھے، عام پبلک کو قہرمانی طاقت کے زور سے شب و روز محنت و مشقت کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا، تاکہ ان کی گاڑھی کمائی سے زر و سیم کے پیالوں کے تقاضے پورے ہوتے رہیں، شراب و ساغر کے دور چلیں اور

بڑوں کے پیٹ بھریں، لیکن فاتحین عرب کی فوجیں جو برابر فتح و کامیابی سے ہمکنار آگے بڑھتی چلی جا رہی تھیں ان کا یہ حال تھا کہ بھوک کی حالت میں وہ اپنے شکموں پر پتھر باندھتی تھیں، صبر و تقویٰ ان کا شعار تھا۔ ان کا امام، عرب کا بہترین خلیفہ عمر بن الخطاب تھا۔ جو تمام روئے زمین پر بسنے والوں کے لئے عدل و مساوات کو پسند کرتا تھا اور اسی مقصد کے لئے وہ تمام انسانوں کو قابو میں لینا چاہتا تھا۔ اس کے مقاصد یہ تھے کہ اگر میری زندگی نے وفا کی تو روئے زمین کے آخری کنارے پر بسنے والے انسان کو بھی اس کا پورا پورا حق پہنچادوں گا اور کسی کو مظلومیت سے کراہنے نہ دوں گا۔

غرض عربوں نے قلعوں کے دروازوں کو کھٹکھٹایا اور کامیاب ہوئے، انھوں نے قلعوں کی دیواروں کو ہلا ڈالا۔ عام رعایا یہ تماشا دیکھ رہی تھی اور لوگ ایک اچھی حکومت کے امیدوار تھے، وہ اس خدائے شر کے بدترین دشمن ہو گئے تھے، جس نے ان کے جسموں کو اس لئے غلام بنا رکھا تھا کہ امراء داد عیش دیں، وہ اسی لئے ان کے شکموں کو بھوکا رکھتا تھا تاکہ دربایوں اور شہنشاہ کے عیش کو چار چاند لگ جائیں۔ انھیں جب عرب فوجوں کے جلو میں ایک خدائے خیر کی خوشخبری ملی، وہ خدائے واحد جس نے تمام انسانوں کو برابری اور مساوات بخشی تھی تو انھوں نے اپنی کدالوں کے رُخ اس بڑھتے ہوئے اسلامی لشکر کو مدد دینے کی طرف پھیر دیئے یا پھر کچھ وہ قاصر الہمت اور شکستہ عزم لوگ تھے جنہوں نے اگر قلعوں کی دیواریں توڑنے میں ان کی مدد نہیں کی تو ان کا مقابلہ بھی نہیں کیا، بہرحال فاتحین کے لئے قلعوں کا سر کر لینا ایک معمولی نوعیت کا واقعہ ثابت ہوا، امراء اور شاہی خاندان نے فرار اختیار کیا، حیران پریشان اور سرگرداں، مشرق یعنی بلاد ہند و سندھ کا رخ کیا۔ بقیہ رعایا کا یہ حال تھا کہ لوگ اپنے گھروں میں گھی کے چراغ جلا رہے تھے گویا ان کی مشقت و مصیبت کا دور ختم ہو رہا تھا وہ فاتحین کو خوش آمدید کہہ رہے تھے

کیونکہ اب امن کا دور دورہ تھا۔ ان کی عقیدت کی پیشانیاں اس خدائے خیر کی بارگاہ میں جھک رہی تھیں جو ان کے لئے پیغامِ مسرت و بشارت بن کر نمودار ہوا تھا۔ خدائے شر یعنی آہرمانِ قدیم آج ان کے پاس سے جا چکا تھا، وہ کسریٰ اور اس کے امرائے دربار کے ساتھ مشرقی سرحدوں کو عبور کر کے بھاگ چکا تھا اور بہت دور بھاگ گیا تھا۔

(یزدجرد) " مدائن سے بھاگ کر فارس کی مغربی جانب شہر "کابل" میں پہنچا۔ کابل میں شاداب چراگاہیں اور عود و زعفران کی کثرت ایک شاہی حیثیت رکھتی تھی۔ ہندوستان و سجستان کے اس درمیانی سرحدی علاقہ (۱) کو اس نے دادِ عیش دینے کے لئے منتخب کیا۔ وہ اپنے ہمراہ اپنی کنیزوں، گھر والوں اور شہزادیوں کو بھی لے گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے قلعہ کو درست کیا۔ اس کی حفاظت کے لئے پہرہ دار فوجیں معین کیں۔ وہ فوجیں جن کا مقصدِ حیات اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ شاہ کی لذت کوش زندگی کی حفاظت کریں اور ہر قسم کے خوف و ہراس کو اس سے دھکیل دیں۔ لیکن کچھ عرصہ نہ گزرا تھا کہ عربی فوجیں کابل میں بھی داخل ہو گئیں (۲) انھوں نے وہاں بھی کسریٰ کے دروازوں کو جا کھٹکھٹایا۔ شاہی فوج نے اس وقت ہتھیار ڈالے جب کہ قلعہ کے محافظ مارے گئے۔ اعیانِ سلطنت اور یزدجرد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ فاتحین کو حق پہنچتا تھا کہ وہ مردوں اور عورتوں کو قید کریں کیونکہ نہ انھوں نے ہتھیار ڈالے تھے اور نہ قتال و قہر سے باز آئے تھے۔ شہزادیاں قید ہو کر امیرِ لشکر کی خدمت میں پیش ہوئیں جن کو فوراً دیگر قیدیوں کے ہمراہ حضرت عمر فاروق کی خدمت میں مدینہ روانہ کر دیا گیا (۳) کہ وہ ان سے متعلق جو چاہیں فیصلہ کریں۔ تمام امور کا ان ہی کو اختیار ہے۔ خواہ آزادی بخشتے ہوئے واپسی کی اجازت دیں یا قیدی بنا کر وہیں رکھیں (۴)۔

یہ قیدی دارالخلافہ مدینہ میں پہنچے۔ مدینہ میں اس سے پیشتر اتنی کثیر تعداد میں اور اس قدر
بھاری قیمت رکھنے والے عظیم الشان قیدی کبھی نہ پہنچے تھے۔ عرب کے متمول اور اونچے گھرانوں
کے لوگ ان قیدیوں کو خریدنے کے خیال سے دارالخلافہ کی طرف رخ کرنے لگے، ان قیدیوں کے
عوض جو کچھ قیمت وصول ہوئی وہ بیت المال میں داخل کر دی گئی۔ بالغرض خلیفہ کی رائے یہی ہوئی
کہ ان لوگوں کو فروخت کر دیا جائے۔ چنانچہ لوگوں نے بھی خریدنے میں دلچسپی لی۔

قیدیوں کا حال یہ تھا کہ وہ اپنی قسمت کے اس فیصلہ پر خود کو بالکل تیار پا رہے تھے
کیونکہ ان کو نظر آ رہا تھا کہ ہمیں اب ماضی کے ظلم، استبداد، قتل، بھوک اور ذلت سے نجات مل جائے
گی۔ پھر ان کی فروخت کا یہ واقعہ ان کے لئے انوکھا بھی نہ تھا کیونکہ وقت کا عام قانون یہی تھا، نیز
ان ہونے والے غلاموں اور باندیوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ مسلمانوں پر قانوناً ان کے حقوق بالکل وہی
ہیں جو عام احرار کے ہیں۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان کو خریدنے والے پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے
کہ وہ مملوکوں کے ساتھ وسیع القلبی کا سلوک کرتے ہوئے ان کو تعلیم و تربیت دیں اور ان کے
مقام کو معاشرہ میں اونچا کریں۔ چنانچہ ان سے اگر وہ شادی کرنا چاہیں تو ان کو پہلے غلامی سے
آزاد کریں۔ اب ہر کنیز "امّ" (۵) یعنی ماں کا درجہ لے لیتی ہے، آزاد کردہ غلام اور باندی کو
حق ولاء حاصل ہو جاتا ہے (۶) ولاء کو قرابت و عزت میں وہی مقام حاصل ہے جو نسبی قرابت و
رشتہ کو حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ انھوں نے یہ بھی سنا تھا کہ رسول امین (صلعم) نے آقاؤں پر یہ
بھی حرام کیا ہے کہ وہ ان کو اپنا غلام سمجھیں، یا ان کو بدنما الفاظ والقاب سے تکلیف دیں۔ چنانچہ
رسول نے ہدایت کی تھی کہ یہ کوئی شخص نہ کہے کہ "میرا غلام، میری باندی" بلکہ اس طرح کہے،
"میرا نوجوان، یا عورت، یا لڑکا" (۷) رسول اللہ نے ان سے یہ بھی کہا تھا، "جس شخص کے
پاس باندی ہو، وہ اسے بہترین تربیت و تعلیم دے، آزاد کرے اور پھر اس سے نکاح کرے تو

اس کو دوگنا ثواب حاصل ہوتا ہے۔" (۸)

کابل کے قیدیوں کو یہ سب کچھ معلوم تھا۔ وہ مدینہ میں اس طرح داخل ہوئے گویا فاتح و منصور ہیں اور ایک باعزت سلوک کے معاشرہ میں دیئے جانے والے ہیں۔ اب ان کو فارس کی حریت، کسریٰ کی عدالت اور دینِ قدیم کے حقوق کے مقابلہ میں کہیں بہتر حریت و حقوق ملنے والے تھے، فارس کی عورتیں اس حالت میں خلیفۂ وقت حضرت عمر کے دربار میں لائی گئیں کہ وہ خود مردوں کا اپنے لئے انتخاب کر رہی تھیں اور اپنی قیمت خود چکا رہی تھیں۔ اب ان کے ضمیر کی گہرائیوں سے یہ صدا پھوٹ رہی تھی، لا الٰہ الا اللہ، محمد رسول اللہ۔

قیدی فروخت ہو چکے، ان کی قیمت بھی بیت المال میں داخل ہو چکی۔ ہر شخص اپنے اپنے خرید کردہ غلام یا باندی کو اپنے ہمراہ لے کر بارگاہِ خلافت سے جا چکا ہے۔ لیکن ابھی یزدجرد بن کسریٰ کی بیٹیاں باقی ہیں، وہ اس قدر قیمتی ہیں کہ کسی میں ان کی قیمت ادا کرنے کی قوت نہیں، یہ تین شہزادیاں ہیں، سرزمین کسریٰ ایسی جن کے حسن کا جواب نہ تھا۔ حضرت عمر نے لوگوں کو ان شہزادیوں کے خرید لینے کی بھی اجازت دے دی، نگاہیں ان شہزادیوں کی طرف اٹھیں۔ یہ کسریٰ کی ناز و نعم میں پلی ہوئی لڑکیاں ہیں جن کو آج ذلت نے شکستہ کر دیا ہے اور جن کی آنکھوں سے آنسو چھوٹ رہے تھے۔

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ ان کو حضرت علیؓ نے جو اس وقت وہاں تشریف رکھتے تھے دیکھا، شہزادیوں کی اس حالت زار پر اُن کا دل بھر آیا حضرت عمرؓ سے ارشاد فرمایا۔ "شہزادیوں کے ساتھ دیگر لڑکیوں کا سا سلوک کرنا مناسب نہیں!" حضرت عمرؓ بولے:۔ "پھر تم ہی کچھ ان کے بارے میں مشورہ دو" علیؓ نے فرمایا:۔ "ان کی خوب بھاری قیمت لگائی جائے، اور ان کو اختیار دیا جائے کہ یہ جس شخص کو چاہیں انتخاب کر لیں" حضرت عمرؓ نے اس رائے کو پسند کیا۔

قیمت لگنی شروع ہوئی، قیمت چڑھتی ہی چلی گئی، آخر لوگ آگے بولی دینے سے رک گئے۔

لوگ خاموش ہو گئے تو ان کے چلے جانے کے بعد حضرت علیؓ نے فرمایا:۔ میں ان کی قیمت ادا کر دوں گا۔ چنانچہ آپ نے گراں ترین قیمت ادا کی، جو بیت المال میں داخل کر دی گئی۔ پھر ان شہزادیوں کو حقِ انتخاب دے دیا گیا، ان تینوں نے قریش کے تین نوجوانوں کو انتخاب کیا، یہ سب نوجوان سردار اور مردِ میدان تھے۔ ایک نے ان میں سے عبداللہ بن عمر بن خطاب کو انتخاب کیا۔ دوسری نے محمد بن ابی بکر صدیقؓ کو، اور تیسری شرم و حیا کی پیکر، نگاہیں نیچی کیے اٹھی اور چند قدم چل کر اپنا ہاتھ اپنے بلند نصیبہ کی طرف اٹھانے لگی۔ اس نے ایک نوجوان کے سر پہ ہاتھ رکھا، جو حضرت عمر و حضرت علی کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ شہزادی کی طرف سے یہ اس نوجوان کا استقبال و اعزاز تھا، یہ نوجوان حسین بن علی تھے اور یہ شاہزادی شہر بانو یزدجرد بن شہریار کی بیٹی تھی، اس انتخاب پر حضرت علی بن ابی طالب نہایت مسرور ہوئے اور آپ کا چہرۂ انور چمکنے لگا۔ اپنے صاحبزادے حضرت حسینؓ سے فرمایا: "ابو عبداللہ! مبارک ہو، تم اس کے ذریعہ روئے زمین پر سب سے بہترین اولاد کے باپ بن گئے!"

شہر بانو "کو حضرت حسین اپنے ہمراہ گھر لے آئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شہزادی کو جلد ہی محسوس ہو گیا کہ اس کی تقدیر نے یاوری کی ہے اگر وہ قیدی اور راندۂ عیش و عشرت نہ بھی ہوئی ہوتی اور اس کو اپنے شریکِ زندگی کے انتخاب کا حق دیا جاتا تو اس وقت بھی وہ اسی نوجوان کو انتخاب کرتی۔ اس سے بہتر انتخاب وہ نہ کر سکتی تھی۔ کیوں کہ حسینؓ اس صاحبِ رسالت کا نواسہ ہے کہ جس نے تمام دنیا کو خدائے خیر کی طرف بلایا اور اس کی والدہ فاطمۃ الزہرا اسی رسول کی صاحبزادی تھیں، اگر تمام روئے زمین کی عورتوں میں دیکھا جائے تو اس جیسی مقدس

عورت نہ ملے گی۔ اس نوجوان کے والد حضرت علیؓ بن ابی طالب ہیں۔ جنھوں نے خلیفہ کی مجلس میں ہماری قدرومنزلت میں اضافہ کیا، ایسا اضافہ جس کے سامنے آزاد و کنیز تمام عورتوں کی عزت ہیچ ہے۔ پھر ہم تینوں شہزادیوں کو بہترین خاوندوں کے انتخاب کا حق دے کر ہم سب پر بے انتہا احسان کیا۔

کچھ زیادہ دن نہ گزرے کہ شہزادی مسلمان ہو گئی۔ اس کے بعد غلامی ختم ہو چکی تھی، اب وہ ایک آزاد دلہن تھی۔ حضرت حسین نے اس کو اسلام کی حسن تعلیم کا وہ زیور پہنایا کہ وہ مدائن کے محلات اور کابل کی شاداب وادیوں کو بھی بھول گئی۔ شہربانو اب ایک نازنین بیوی، حضرت حسین کے گھر کا آفتاب، ہرنی کی طرح آزاد، اور عطر کی خوشبو کی مہک تھی۔ غزالہ، شلافہ، خولہ نام ولقب دیئے گئے۔ حسین، نواسۂ رسول سے شادی ہو جانے کے بعد دلہن کی خوشیاں ماضی کا بہترین بدل بن کر لوٹ آئی تھیں بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اس سے بھی بڑھ کر۔

غزالہ صاحب الرائے، ذہین و عاقل لڑکی تھی۔ اسلام نے اس کے فضائل وکمالات کو اور بھی اجاگر کر دیا تھا۔ اس کے علم و فہم میں فقہ اور دیگر اسلامی علوم کا اضافہ ہو چکا تھا۔ غزالہ کی خواہش تھی کہ حضرت حسین کی اولاد سے اس کی گود بھرے تاکہ باہمی رشتہ محبت کو مزید استواری نصیب ہو اور سادات عرب کی نظروں میں سادات عجم کی قدرومنزلت کے کچھ اسباب و وسائل وجود میں آجائیں۔ اس طرح تمام اونچ نیچ اور باہمی امتیازات کی وہ حدیں درمیان سے اٹھ جائیں جو دونوں قوموں کے درمیان حائل ہیں۔ جیسا کہ اللہ کے رسول نے حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔ "لوگو! تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔"

غزالہ کو امید تھی کہ خداوند تعالیٰ حسین کی اولاد میں سے اسے ایک ایسا لڑکا عطا کرے گا جس کے سامنے عرب عجم کے تمام انسان بیک وقت عقیدت و محبت کی نگاہیں خم کر دیں گے۔ وہ گڑگڑا کر

دعائیں مانگتی تھی ــــ لوگ بدل گئے، زمانہ نے آنکھیں پھیر لیں، دلوں میں فرق آگئے، لیکن حضرت حسین کی خوش معاملگی میں غزالہ نے کوئی فرق محسوس نہیں کیا، اس کا تمام وقت حضرت حسین کی معیت میں عیش و کامرانی کا دور ثابت ہوتا رہا۔ غزالہ نے مزید گریہ وزاری اور انتہائی بیقراری کے ساتھ خدا سے اپنی مراد مانگی۔ حتیٰ کہ دعا قبول ہوئی اور حضرت حسین کے گھر میں غزالہ کے بطن سے چاند سا تصویر نما بچہ پیدا ہوا۔ اس میں حضرت حسین کی شباہت تھی اور ان ہی کے چہرے کی سی رونق تھی۔ نیز ماں کا سا انکسار اور بھولاپن جمال آراء تھا۔ غزالہ کی مسرتیں اور آنکھوں کی ٹھنڈک بیان سے باہر تھیں۔ اس نے نومولود کا نام علی رکھا۔

حضرت حسینؓ کے یہاں لیلیٰ بنت ابی مرہ کے بطن سے ایک اور لڑکا بھی تھا (۹) اس بچہ کا نام بھی علی تھا، لیکن غزالہ کی عرصہ سے آرزو تھی کہ اس کے بچہ ہوگا تو وہ اس کا نام علی رکھے گی، حضرت حسین نے بھی غزالہ کی تجویز کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ ان کو والد ماجد سے اس قدر محبت تھی کہ صاحبزادوں کے ناموں (۱۰) میں علی کی تکرار سے بہت لطف اندوز ہوتے تھے۔ اسی طرح غزالہ بھی اس نام میں حضرت علی کے جمال اور ان کے اس احسان (۱۲) کو یادگار کی حیثیت میں برقرار رکھنا چاہتی تھی کہ انھوں نے اس کو اور اس کی بہنوں کو تاجِ عزت پہنایا تھا اور لوگوں میں فروخت ہونے سے بچالیا تھا اور خلفاء کے گھروں کی بہو بیٹیاں بنایا تھا۔ غزالہ نے حضرت علی کے فضل و احسان کے شکریہ میں نومولود کا نام علی بن حسین تجویز کیا اور خدا کا شکر بجا لائی کہ جس نے اس کی دعاؤں کو قبول فرمایا۔

علی بن حسین حسن و جمال میں لاثانی تھے لیکن کم زور و ناتواں پیدا ہوئے تھے، نگاہوں میں لطیف قسم کی چمک تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ غم میں بجھی بجھی سی ہیں۔ نگاہوں کی یہ شکستہ کرنیں

آنے والے الم ناک حادثہ کی خبر دے رہی تھیں۔ علی بن حسین کی والدہ غزالہ کو زچگی میں شدید بخار ہوا حضرت حسینؓ نے تیمارداری اور علاج کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا لیکن بخار کی آگ کو وہ ہزار کوشش کے باوجود بجھا نہ سکے، غزالہ ایسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو رہی تھی کہ گویا اپنی تمناؤں کی دنیا "علی بن حسین" کو حسرت سے ٹپکتے ہوئے موتیوں کا ہار پہنا کر الوداع کہہ رہی ہے۔

علی اصغر ابن حسین کی ایک آزاد شدہ کنیز کے حوالہ کر دیئے گئے، یہ کنیز حضرت حسینؓ کی امّ ولد تھی ہے (۱۱) جس نے علی اصغر کو اپنا دودھ پلایا اور ایک رحم دل ماں جس طرح اپنے لخت جگر کی خبر گیری کرتی ہے اسی طرح یہ اس بچہ کی پرورش پر متوجہ ہوئی، علی اصغر کو مرنے والی ماں حقیقی ماں کے حالات و واقعات سے بالکل بے خبر رکھا گیا تھا۔ ان کی پرورش ایک ایسے ماحول میں ہوئی تھی کہ زمانہ شعور میں بھی ان کو یہ علوم نہ ہو سکا کہ میری حقیقی والدہ فوت ہو چکی ہے اور وہ اس امّ ولد کو امی کہہ کر پکارتے، اور وہ ان کو جواب میں بیٹا! کہتی، یہ بے خبری اتفاقی واقعہ نہیں تھا، بلکہ تمام اہل خانہ نے طے شدہ منصوبہ کے ماتحت والدہ کی وفات کے واقعہ کو ان سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی تھی تاکہ ان کے ننھے منے دل کو احساسِ غم سے محفوظ رکھا جائے۔

کم سنی ہی میں احساس و شعور، بزرگوں کا ادب اور بڑوں کے حقوق کا پاس انھیں اس قدر تھا کہ جب کچھ بڑے ہوئے تو محسوس کیا کہ عام طور پر ماؤں کا جو رویہ اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے میری والدہ کا معاملہ اس شفقت و عنایت میں بہت آگے ہے حتیٰ کہ جب دونوں کا کھانا تیار ہو کر آتا تو والدہ بغور کھانے کو ملاحظہ کرتی ہے اور پھر اس وقت تک کھانے کو ہاتھ نہ لگاتی جب تک بچہ اپنا من پسند کھانا اس میں سے کھا نہ لے، بچہ نے شدت سے اس امر کو محسوس کیا اور کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ ماں نے ہمراہ کھانے کے لئے بلایا، اصرار کیا، گھر والوں

نے برا بھلا کہا لیکن بچہ نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔

گھر والوں نے وجہ پوچھی، کہ تم تو بڑے باادب، بزرگوں کا احترام کرنے والے بچے ہو، پھر کیوں ماں کا حکم نہیں مانتے ؟ جب ہر چہار طرف سے بوچھار ہوئی، اور وجہ بتلانے کے سوا اُن کے لئے کوئی چارۂ کار نہ رہا تو کہا "میں ادب و تہذیب کے خلاف سمجھتا ہوں کہ جس کھانے پر میری ماں کی نظر پڑ چکی ہو، میں وہ کھانا ماں سے پہلے کھاؤں، ہو سکتا ہے اس میں کوئی چیز ماں کے لئے مرغوب ہو، لیکن وہ اس کو میری خاطر نہ کھا رہی ہوں، ایسی صورت میں میرا اس چیز کو کھانا صریح طور پر ماں کی نافرمانی کرنا ہوگا۔ (۱۲)

•

پاکیزہ قلبی، اطاعت اور علم وحافظہ کے لحاظ سے وہ دورِ تاریخ اسلام کا زریں دور تھا، قلب گوش، مجالس علمیہ کی طرف اس طرح وقف تھے گویا پانی کی سطح پر فضا میں کوئی پرندہ معلق ہے، علم از خود دلوں میں اتر رہا تھا۔ عمر اور شعور کی قید نہ تھی، چھوٹے بڑے سب ہی پروانہ وار علمی حلقوں کی طرف کھنچ رہے تھے، مدینہ کی مسجد صحابہ اور پاکیزہ دل تابعین کے اوّلیں گروہ سے معمور تھی۔ یہ حضرات قرآن وحدیث کے مذاکروں میں یا مسلسل نماز روزوں میں مشغول رہتے، اس مسلسل انہماک سے ان کے جسم لاغر اور ان کی آنکھوں کے حلقوں میں گڑھے پڑ گئے تھے، ساری ساری رات عبادت کے بعد دن کو وہ حضرات پراگندہ بال، غبار آلود اور زرد رنگ دکھائی دیتے، ان کی پیشانیوں پر سجدوں کی کثرت سے گھٹے پڑے ہوئے تھے، وہ تمام رات بیدار رہ کر کتاب اللہ کی تلاوت کرنے میں مشغول رہتے، ان کے پاؤں اور پیشانیاں اسی حالت میں آرام و راحت پسند کرتی تھیں۔ ذکرِ الٰہی کے وقت وہ اس طرح جھومتے جس طرح ہوا سے درخت جھومتا ہے، اُن کی آنکھوں سے اس کثرت سے آنسو جاری ہوتے کہ ان کے کپڑے اور صحنِ مسجد آنسوؤں سے تر ہو جاتا۔

۱۰۰۱۸

حضرت علی بن حسین فرماتے ہیں "خدا کی قسم وہ لوگ اس وقت ہر چیز سے غافل ہو جاتے تھے!"

اپنے دوسرے بھائیوں اور چچیرے بھائیوں کے ہمراہ ان کے قدم مسجد نبوی کی طرف اٹھنے لگے، عمر ابھی دس سال کی بھی نہ ہوئی ہوگی، کہ قرآن و حدیث کی تشریحات سے کان آشنا ہونے لگے اپنے والد حضرت حسین اور دیگر صحابہ و تابعین کی علمی مجلسوں میں آمد و رفت ہونے لگی، طلب علم کا شوق ابھرنے لگا۔ کبھی اپنے چچا حضرت حسن کی علمی مجلس میں حاضری دیتے اور کبھی جابر بن عبداللہ انصاری، ابن عباس، مسور بن مخرمہ، ابو الحسین ہاشمی مدنی اور ابن عمر وغیرہ کی خدمت میں پہنچتے۔ بسا اوقات اپنی ماں۔ آزاد شدہ کنیز۔ کے ہمراہ امہات المومنین حضرت عائشہؓ، صفیہؓ اور ام سلمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہاں ان کو بہت کچھ علمی باتیں اور روایات رسول اللہ معلوم ہوئیں۔

علی بن حسین اس کو بھی معیوب نہ خیال کرتے کہ تابعین کی مجلسوں میں علم و حدیث کے استفادہ کے لئے حاضر ہوں، چنانچہ بکثرت مختلف درس گاہوں میں پہنچے اور ہر وقت اپنی طبیعت کو علم اور اہل علم کے لئے کشادہ پایا، علمی بات جہاں سے حاصل ہوتی اور ان کو حق و صدق اس میں نظر آتا تو بے تکلف اس کو اخذ کر لیتے، وہ بلا وجہ کسی کو کسی پر فضیلت نہ دیتے، حضرت علی بن حسین کی علمی مہارت، نور بصیرت اور ذہانت، حقیقت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و فضل کا ورثہ تھی جس سے انھیں پورا پورا حصہ ملا تھا۔ وہ بہت سرعت کے ساتھ ایک امام وقت کے مقام کی طرف ترقی کر رہے تھے، وہ وقت تقریباً آچکا تھا کہ رائے، اجتہاد، تصدیق و تضعیف اور تصحیح و تغلیط میں مرجع خلائق بنیں، علمی شعور، ادراک، حفظ و سماع، فکر و استنباط نے ان کو اب بہت اونچے مقام پر پہنچا دیا تھا۔

ان کا قلبی رجحان، دلی گرویدگی، اور عشق کا سا سوز قرآن کے لئے وقف تھا، وہ اس کو پڑھتے، اس کے اسرار و نکات سمجھتے، اور ہر تحقیق کو اس کے اصل مقام پر موڑ دیتے، ان

کا دل قرآن میں ایک لوحِ مکتوب اور صحیفۂ محفوظ بن گیا تھا، اس کا کوئی لفظ اور کوئی حرف ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ تھا، وہ جس وقت اس کو پڑھتے تو خوف و خشیت سے لرزہ براندام ہو جاتے۔ جس وقت آیات کی تشریحات اور ان کے وسیع مفہوم کی تقریر کرتے تو سننے والوں پر ان ہی کا سا خوف اور خشیت طاری ہو جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا قرآن صرف علی بن حسین ہی کو یاد ہے اور سب لوگ بھولے ہوئے ہیں۔

آپ کو کسی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ ان کو جس ماں نے جنم دیا تھا وہ زچگی کی حالت ہی میں دنیا سے کوچ کر چکی ہے۔ یہ ماں جو ان کی پرورش کی ذمہ دار ہے، درحقیقت ان کے والد کی امِّ ولد ہے، وہ اس نیک شعار منہ بولی ماں کے احسان و شفقت پر حیران تھے کہ اس کے باوجود وہ ان کے لئے آنکھیں بچھاتی ہے، حالانکہ وہ اس کے لختِ جگر نہیں ہیں۔ اس کے بعد آپ کو محسوس ہوا کہ وہ ان کنیزوں کے احسان و سلوک کی وجہ سے ان کے مقروض ہیں، لازم ہے کہ عمر بھر اپنی طاقت ان کی دل جوئی اور آرام کے لئے وقف کر دیں، بلکہ یہ معلوم ہو کر ان کی اس محبت میں اور بھی اضافہ ہوا کہ ان کی حقیقی والدہ شہر بانو جو قید ہو کر آئی تھیں وہ بھی کنیز تھیں، ان کی یہ مسرت تکبر، فخر بازی سے خالی تھی جب کہ انھیں معلوم ہوا کہ ان کی والدہ شہر بانو ایک شہزادی تھیں۔ ان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے دادا حضرت علی بن ابی طالب ان عورتوں کو باعزت بنانے اور لوگوں پر ان کی قیمت کو بلند تر کرنے میں بیحد کوشاں تھے۔ حضرت علی نے شہر بانو کو حسینؑ کی دلہن بنانے میں ایک ایسے وقت میں نہایت کامیاب پارٹ ادا کیا جب کہ فاتحین ان کو دور دراز علاقوں سے غلام بنا کر لانے میں مصروف تھے!

اس طرح اس کی نظریں غلاموں اور باندیوں کے مسئلہ پر جم کر رہ گئیں، ان کے دل نے

محسوس کیا کہ غلاموں اور احرار کے درمیان مساوات قائم ہونی ضروری ہے۔ اس خیال میں اس وقت اور بھی پختگی ہوئی جب کہ ان کو یہ معلوم ہوا کہ دینِ اسلام، مساوات کا علَم بردار ہے، انھوں نے عزم کر لیا کہ وہ کسی کو بھی اس کے نام کے علاوہ اور کسی لقب سے نہیں پکاریں گے، وہ کسی غلام کی کسی نازیبا حرکت اور باندی کے کسی قصور پر ناراض ہو کر کبھی ان کو سزا نہیں دیں گے، انھوں نے اپنے دل میں قسم کھائی کہ نہ صرف مدینہ بلکہ دنیائے اسلام کے ان بازاروں میں پہنچ کر کہ جن میں ان انسانوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے غلاموں اور باندیوں کو خرید خرید کر آزاد کریں گے اور جہاں تک ان کے بس میں ہوگا وہ اس رسم کو ختم کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے!

حضرت حسن کی وفات پر گویا مدینہ کے در و بام میں زلزلہ آ گیا اور اس وقت تو لوگ حیران ہی رہ گئے جب معلوم ہوا کہ یزید تختِ سلطنت کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ علی بن حسین صرف در و بام کو ہی نہیں بلکہ روئے زمین کے آخری کناروں کو گویا دیکھ رہے تھے کہ وہ بھی مدینہ کے ساتھ ساتھ لرز رہے تھے، لیکن یہ احساسِ شکست براہِ راست مدینہ کو بہ نسبت دوسرے شہروں کے اپنی لپیٹ میں زیادہ لئے ہوئے تھا۔ حکام و ولاۃ کا استبداد ناقابلِ برداشت تھا اور ان کا سیاسی مکر ہر طرف تسلط جما رہا تھا۔ علی نے اپنے والد حضرت حسین کو دیکھا کہ وہ نہایت سختی سے یزید کی تولیت کا انکار کر رہے ہیں اور یزید بھی انتہائی طور پر حضرت حسین کے اس انکار پر سراسیمہ ہے آگ کے ان شعلوں میں تمام اہلِ بیت جن میں علی بھی ہیں برابر کے شریک تھے، مرد، عورتیں، آزاد، غلام کون تھا جو یزید کی اس ناپاک بساطِ سیاست پر جذبۂ انتقام سے بھرا ہوا نہیں تھا، یزید وہ شخص تھا جس سے امت کے لئے بھلائی اور بہبودی کی امید قائم نہ کی جا سکتی تھی۔

علی بن حسین موالی کے منتقمانہ جذبات پر حیران تھے کہ وہ امر اوپر سبقت لے گئے، وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ بھی ہماری ہی طرح انسان ہیں، جو قومی فلاح کی ترقی اور شر کا سر کچلنے میں کسی طرح ہم سے پیچھے نہیں ہیں، عربی وعجمی میں کوئی فرق نہیں، بلکہ موالی حریت کے زیادہ محتاج ہیں، ضرورت ہے کہ ان کی غلامی کے بندھنوں کو توڑ کر انھیں تاریک غاروں سے باہر لایا جائے۔

غرض باندی، غلام، جوان لڑکے اور لڑکیاں، کوئی بھی ایسا نہ تھا جو ان بچوں اور حرم کی خدمت کرنے کے لئے حضرت حسینؓ کے ساتھ چلنے کا مشتاق نہ ہوا ہو، علی بن حسین نابالغ ہم عمروں کے لئے اور اپنے ہی جیسے بنی ہاشم کے دوسرے لڑکوں کی طرح اس قافلہ میں شریک سفر تھے، وہ اس وقت قریب البلوغ تھے یا سن بلوغ میں قدم رکھ چکے تھے۔ بہرحال جس وقت یہ جنگ ختم ہوئی اس وقت زندہ رہنے والے بچوں میں وہ سب سے بڑی عمر کے تھے۔ (۱۳)

---

(۱) معجم البلدان جلد ۷ صفحہ ۲۰۱

(۲) تاریخ الیعقوبی جلد ۳ صفحہ ۴۹

(۳) کتاب الخراج مصنفہ امام یوسف صفحہ ۱۲۵

(۴) " " " " صفحہ ۱۹۱

(۵) الاسلام والحضارۃ العربیۃ صفحہ ۹۸

(۶) بدائع الصنائع جلد ۴ صفحہ ۱۵۸

(۷) الاسلام والحضارۃ العربیۃ صفحہ ۹۸

(۸) الوحی المحمدی، صفحہ ۲۹۵

(۹) الطبری جلد ۴، صفحہ ۳۴۰

(۱۰) زینب عقیلہ بنی ہاشم، صفحہ ۸۸

(۱۱) اعیان الشیعہ، جلد ۴، صفحہ ۱۹۴

(۱۲) عیون الاخبار جلد ۳، صفحہ ۹۷

(۱۳) جمہور مورخین کی رائے ہے کہ اس واقعہ جنگ کے وقت علی اصغر کی عمر اکیس سال تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان لوگوں کا وہم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے دوسرے بڑے بھائی جن کو علی اکبر کہا جاتا ہے اس جنگ میں بعمر ۱۹ سال شہید ہوئے تھے، علاوہ ازیں طبقات الشعرانی میں ہے کہ علی اصغر اس وقت ۱۱ سال کے تھے، بہر حال واقعات کے بیان میں ہم نے اس موقعہ پر اسی لئے اُن کی عمر کا تذکرہ گول مول رکھا ہے (تفصیل کے لئے طبقات الکبریٰ للشعرانی کا مطالعہ کیا جائے۔ جلد ا صفحہ ۳۱)

خدائی حفاظت

علی اصغر، اپنے والد اور اہل بیت کے ہمراہ اونٹوں کے پالانوں، اور گھوڑوں کی پشت پر سفر کر رہے تھے کہ اچانک ان پر بیماری کا حملہ ہوا، بدن گھلنے لگا حتیٰ کہ بیماری نے بالکل ہی لاچار بنا کر بٹھا دیا۔ وہ اپنے بستر پر ہر چیز سے غافل لیٹے رہتے، گاہے گاہے، آنکھ کھول کر دیکھ لینے کے سوا، ان کو اپنے ماحول کی کچھ خبر نہ رہی، ایک عرصہ کے بعد ہوش آیا تو دیکھا کہ وہ ایک خیمہ میں فرو کش ہیں جس میں ہر طرف خاموشی اور اداسی چھائی ہوئی ہے یا باہر کی جانب سے خوفناک آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ آپ کی پھوپھی زینب نے بیماری کی شدت و تکلیف محسوس کرتے ہوئے تیمار داری کی طرف توجہ دی۔ وہ جس وقت جنگ کا خونیں منظر دیکھتی تھیں تو ان کو مستقبل کے پردے پر کچھ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ خاندان اہل بیت میں شاید صرف یہی مریض زندہ رہ جائے گا۔ ان کے دل کی گہرائیوں میں تمنا بھی یہی تھی کہ کم از کم یہی بچہ صحیح سلامت باقی بچ جائے، شاید یہ مرض اس کے لئے بچاؤ کا بہانہ ثابت ہو رہا ہے تاکہ حسین کی نسل قائم رہے۔ وہ مریض پر جھکی ہوئی اس کی دیکھ بھال کرنے، ذرا سا پینے اور اس کے لئے پانی محفوظ رکھنے میں مشغول تھیں کیونکہ مریض بچہ تھا، معلوم نہیں کس وقت اسے پانی کی ضرورت پڑ جائے۔

حضرت حسینؓ نے دیکھا کہ بیماری کا شدید حملہ ہے، چاہا کہ صاحبزادہ سے تکلیف کو کچھ ہلکا کر دیں۔ فرمایا۔ "بیٹا! کس چیز کو جی چاہتا ہے، طلب کرو!" عرض کیا "ابا جان! بس میرا جی

یہ چاہتا ہے کہ میں ان لوگوں میں سے ہو جاؤں جو اللہ سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتے، بلکہ وہ خود ہی ان کے لئے تدابیر کرتا ہے۔" اس جواب پر حضرت حسینؑ نہایت خوش ہوئے، آنکھوں کو ٹھنڈک محسوس ہوئی اور فرمایا: "بیٹا! تم نے بہت اچھی بات کہی، جبرئیل نے ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا تھا کہ کوئی حاجت ہو تو فرمایئے، پوری کروں۔ حضرت ابراہیم نے جواب دیا کہ میں اللہ پر نظر رکھتا ہوں وہی میرے لئے کافی اور کارساز ہے۔ تمہاری اس بات میں ابوالانبیاء حضرت ابراہیم کے قول کی پوری جھلک نظر آتی ہے۔ (۱)

بالآخر جنگ کا یہ ہولناک قصہ ختم ہوا، عبیداللہ بن زیاد کے سامنے حضرت حسین کا سر لاکر رکھا گیا، عین اسی وقت اس کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا، عبیداللہ بن زیاد اور اس کے ان تمام دوستوں کو جو اس کے ہمنوالہ و ہم پیالہ تھے دسترخوان پر بلایا گیا تھا۔ ابن زیاد کھانا کھا رہا تھا اور خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا۔ علی بن حسین اسوقت وہاں موجود یہ تمام ماجرا دیکھ رہے تھے۔ ابن زیاد نے ان کی طرف التفات کیا، ان کے دل میں بھوک کی وجہ سے خیال آیا کہ خوشبوؤں میں مہکتے ہوئے اس کھانے میں، میں بھی حصہ لوں۔

طبیعت میں کھانے کی طرف رغبت پیدا ضرور ہوئی لیکن انھوں نے فوراً ہی اپنے والد بزرگوار کو یاد کیا جبکہ شہادت سے کچھ ہی دیر پہلے انہوں نے ان سے استفسار فرمایا تھا کہ "تمہارا کس چیز کو جی چاہتا ہے؟" تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ یہی جی چاہتا ہے کہ کسی چیز کو جی نہ چاہے۔ مگر اس وقت دھڑکتے ہوئے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش ایک روز ایسا بھی آجائے کہ ان کے سامنے ابن زیاد کا سر لایا جائے اور وہ بھی اس وقت لوگوں کو کھانے پر مدعو کئے ہوئے ہوں۔ کچھ دیر نہ گزری تھی کہ بچے کے دھڑکتے ہوئے دل کی یہ تمنا پھڑکتے لبوں پر دعا بن کر

لگی ماس نے اپنے رب سے سرگوشی کے انداز میں اپنی دلی آرزو پیش کی اور عرض کیا، اے رب! مجھے بھی میری زندگی میں ابنِ زیاد کا کٹا ہوا سر دکھا جبکہ میں بھی اسی طرح اس وقت کھانا کھانے میں مشغول ہوں۔ (۲)

یزید نے جس وقت اہل بیت کو مدینہ واپس جانے کا حکم دیا اس وقت نماز باجماعت کا وقت ہو چکا تھا۔ مسجد نمازیوں سے دیکھتے دیکھتے بھر گئی۔ علی بن حسین اور ان کے ارد گرد بنی ہاشم کے دوسرے بچے نماز پڑھنے میں مشغول ہو گئے، ہر طرف سے ان ننھے نمازیوں پر لوگوں کی نگاہیں مرکوز تھیں۔ آپس میں کچھ گفتگو ہو رہی تھی۔ لوگوں نے اپنی تمنا کا اظہار کیا کہ علی بن حسین سے کچھ تقریر سننی چاہیئے۔ یہ آرزو یک بارگی تمام نمازیوں میں سرایت کر گئی۔ یزید کے کان میں آہستہ سے عرض کی گئی کہ لوگوں کی خواہش ہے علی بن حسین سے کچھ سنا جائے۔ کاش آپ اجازت دے دیں!

لوگوں کی خواہش اتنی زبردست تھی کہ یزید کو مجال انکار نہ رہی۔ بادلِ ناخواستہ وہ اجازت دینے پر مجبور ہو گیا، مگر اس کا خیال تھا کہ علی بن حسین کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف منہ سے نہ نکالیں گے بلکہ اُسے امید تھی کہ میں نے جو ان لوگوں پر احسان کرتے ہوئے چھوڑ دیا ہے یہ اس پر اظہار تشکر کریں گے۔ غرض ہاشمی نوجوان کو منبر کی سیڑھیوں پر چڑھا دیا گیا اور دیکھتے دیکھتے بچہ منبر کے بالائی حصہ پر سنبھل بیٹھا۔ اس کے عظمت و جلال سے لوگ خاموش تھے۔ ان کے سانسوں کی آمد و رفت گویا منقطع ہو گئی تھی۔ علی نے تقریر کی اور بڑی لمبی تقریر سے لوگوں کو خطاب کیا۔ یہ خاصا طویل وقت لوگوں پر اس طرح گزر گیا کہ کسی کو وقت کا احساس تک نہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وقت کی رفتار مدہم پڑ گئی ہے۔ لوگ برابر متوجہ تھے۔ انکی مزید خواہش تھی کہ بچہ کی آواز کو دوسری کوئی آواز بند نہ کر پائے کیونکہ انھیں پہلی بار آج ایک سچی آواز کی گونج اور شیریں بیان سننے کا موقعہ ملا تھا۔

علی بن حسین تقریر کر رہے تھے، وہ لوگوں کے سامنے اہل بیت میں سے ایک ایک کے مفاخر و فضائل اور ملت اسلامیہ پران کے احسانات گنوا رہے تھے، وہ برابر بولتے گئے حتیٰ کہ لوگوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی، قریب تھا کہ تمام مجمع دھاڑیں مار مار کر رو پڑے، یزید کو اس خلاف توقع صورت حال سے بڑی پریشانی ہوئی اور تو کوئی تدبیر اس سے بن نہ آئی۔ اس نے مؤذن کو آذان دینے کا حکم دیا تاکہ تقریر آگے نہ بڑھ سکے۔ شاہی حکم پاتے ہی مؤذن پکارا "اللہ اکبر، اللہ اکبر"

علی بن حسین جو اس وقت بھی منبر پر ہی بیٹھے تھے بولے "بے شک کوئی چیز اللہ سے بڑی نہیں ہو سکتی۔"

پھر مؤذن نے وقفے کے بعد کہا "اشہدان لا الہ الا اللہ۔"

علی :۔ بیشک میرے دل، خون، گوشت اور تمام ہوش وحواس کی بھی یہی شہادت ہے۔

مؤذن :۔ اشہدان محمد رسول اللہ

علی نے یزید کو مخاطب کر کے پوچھا، "یزید! بتا، یہ میرے نانا تھے یا تیرے؟" اگر تو کہتا ہے، "کہ میرے نانا تھے،" تو تو جھوٹا ہے اور اگر تسلیم کرتا ہے کہ واقعی میرے نانا تھے تو بتا کہ پھر تو نے کیوں رسول کی ذریت کو ذبح کیا؟" یزید ایسا بوکھلایا کہ کوئی جواب نہ دے سکا، مؤذن نے اس عرصے میں آذان پوری کر لی تھی۔ علی منبر سے نیچے اتر آئے اور خدا کے حضور دست بستہ ہونے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ (۳)

حضرت حسین کی نرینہ اولاد میں سے تنہا علی ہی تھے جو زندہ مدینہ واپس پہنچے تھے، ان کے سر پر اب سوائے خدا کے کسی کا سایہ نہ تھا۔ خدا ہی کا ہاتھ تھا جو اُن کی طرف بڑھا، ان کی حفاظت و

حمایت کی اور نجات بخشی حالانکہ ان کے بھی شہید ہو جانے میں کوئی کسر باقی نہ تھی۔ چنانچہ کربلا کے واقعہ کے بعد ابنِ زیاد اور خود یزید اس پر معترض تھے کہ یہ لڑکا کیوں زندہ بچ گیا۔ لیکن ان پر خدا کا سایہ تھا، بیماری اور جسمانی ضعف کے پردے ان کے لئے ساتر بن گئے۔ دشمنوں کی آنکھیں ان کی طرف سے اندھی ہو گئیں اور ان کے دلوں کی خواہش پر پتھر رکھ دیا گیا۔ جب یہ پردہ ان سے ہٹا تو دنیا کو خدا کی حکمت اور اس کا ان پر احسان فرمانا سمجھ میں آ گیا۔

علی موت سے نڈر واقع ہوئے تھے ساتھیوں نے واقعۂ کربلا کے دن بھی اپنی پھوپھی زینب سے لاٹھی اور تلوار طلب کی تھی۔ ان کی آرزو تھی کہ وہ اپنے والد کی جان بچانے کے لئے ان پر قربان ہوتے ہوئے ان سے پہلے دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ لیکن والد نے فرمایا تھا، "تم لاٹھی اور تلوار لے کر کیا کرو گے؟" عرض کیا، "تلوار سے لڑونگا، اور لاٹھی پر اپنے کمزور جسم کو سہارا (۴) دونگا!" بات یہ تھی کہ علی والد اور دیگر اہلِ بیت کے بعد جینا نہ چاہتے تھے۔ اس اندوہناک واقعہ کے بعد مدت العمر کسی نے انکو مسکراتے یا ہنستے نہیں دیکھا۔ ان کی حالت اب اس گوشہ گیر زاہد و عابد کی سی ہو چکی تھی جو دنیا سے بالکل بے واسطہ ہو گیا ہو۔ لیکن علی نے خدا کی مرضی پر شکر کیا۔ حیات، موت، صحت اور بیماری تمام حالتوں کو اسی کی قدرت کا کرشمہ سمجھتے ہوئے صبر و شکر سے کام لیا۔ انھیں محسوس ہوا کہ خدا کی مرضی یوں ہی تھی۔ قدرت کی مستور حکمت کا یہی تقاضا تھا کہ وہ سلامت رہیں۔ مدینہ واپس ہوں اور اپنے چچا حضرت حسن کی صاحبزادی، فاطمہ سے شادی کریں تاکہ اہلِ بیت کا مقدس خاندان اپنی روایات کے ساتھ روئے زمین پر قائم رہے اور زہر دیئے ہوئے شہید حضرت حسن کا گھرانا آباد رہے۔ سبحان اللہ! خدا کی کارسازی کا کیا کہنا!

علی بن حسین نے مرض و تکلیف کی نعمت اس وقت پائی جب کہ ان کے گھر والوں پر بنی ہوئی تھی۔ یہی بیماری آگے چل کر عافیت و آرام میں تبدیل ہو گئی۔ وہ بیماری کی حالت میں خدا

سے اس طرح دعا مانگتے ہیں جیسے گویا تندرست ہیں، اور اب آرام و عافیت میں وہ اس طرح دعائیں مانگتے تھے گویا نیم جاں ہیں۔ اُن کی بارگاہِ الٰہی میں یہی درخواست تھی:۔

" اے رب! تو نے مجھے اپنی رحمت سے نوازا۔ اپنے احسانات کی مجھ پر بارش کی میں اس امن کی حالت میں بھی تجھ ہی کو پکارتا ہوں اور مجھے تیرا ہی انس ہے، مجھے (۵) نہ کوئی ڈر ہے نہ اندیشہ!

" اے رب! میری دعا اُس بیکس انسان کی طرح ہے جس کو دکھ اور فاقہ نے نڈھال کر دیا ہو۔ کمزوری اور بے تدبیری نے اُسے عاجز و ناچار بنا دیا ہو۔ میں تجھے اب ڈوبتے ہوئے انسان کی طرح پکارتا ہوں کہ جس کی مصیبت کو تیرے سوا کوئی دور نہیں کر سکتا۔

" اے رب! میری طاقت جواب دے چکی، تدبیریں ناکام ہو چکیں، وہ افتاد مجھ پر پڑی ہے کہ جس کو میں سہار نہیں سکتا مجھے اپنے اچھے احسانات کی طرف لوٹا، میں مخلوق سے مایوس ہو چکا، میرے پاس تیری امیدوں کے سوا کوئی سہارا باقی نہیں رہا۔ اے رب! تو مجھ پر ہمیشہ سے احسان کرتا رہا ہے (۶)"۔

علی بن حسین مدینہ آئے تو اپنے گھر گئے اور پھر اُم المومنین اُم سلمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُم سلمہ نے انھیں حضرت حسین کی امانت، مصحف، وصایا اور اسلحہ واپس کئے۔ علی کی رائے ہوئی کہ ان تمام کو فروخت کر دیا جائے۔ چنانچہ اس قیمت سے انھوں نے اپنے والد حضرت حسین کا قرض ادا کیا۔

(حضرت حسین کو شہادت سے پیشتر قرض نے بہت زیر بار کر رکھا تھا۔ وہ کچھ اوپر ستر ہزار دینار کے مقروض تھے) وہ عموماً قرض اس لئے لیا کرتے تھے کہ امورِ خیر میں

اور بیواؤں، یتیموں اور مسکینوں پر صدقہ کریں۔ اگر کچھ مال باقی بچتا تو اس سے اونٹ خرید کر ذبح کرتے، غریبوں اور مسکینوں کو کھانا کھلاتے اور دودھ پلاتے (حضرت حسینؓ کی کچھ مملوکہ جائداد اور زراعتی زمین بھی جس کا خراج (۸) ادا کیا کرتے تھے) اس کے علاوہ زمانۂ عمر رضی اللہ عنہ سے بیت المال کی طرف سے وظیفہ بھی مقرر تھا۔ (۹) والد کی اس جائداد میں سے علی بن حسین نے کچھ جائداد فروخت کر دینے کا ارادہ کیا۔ اس فروخت ہونے والی جائداد میں نجد کا چشمہ "عَینِ جَدِیۃ" اور ایک دوسرا چشمہ "عینِ یحنّس" تھا۔ اس چشمہ کا پانی حضرت حسین کے ایک غلام "یحنّس" نے کھود کر نکالا تھا علی بن حسین نے یہ چشمے ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کے ہاتھوں فروخت کر دیئے اور اس قیمت سے حضرت حسین کا قرض ادا کیا۔ یہ وہی چشمے ہیں کہ جن پر بعد میں آلِ حکیم بن حزام کا وارثانہ قبضہ ہوا)

قرض کی ادائیگی سے فراغت ہوئی تو تمام فرصتیں، عبادتِ الٰہی، نماز، روزہ اور زاہدانہ بود و باش کے لیئے وقف ہوگئیں اور پھر وہی ماضی کے علمی شغل میں دلچسپی، حضرات صحابہ و تابعین کی علمی مجلسوں میں آمد و رفت شروع ہوگئی، حدیث، فقہ اور قیاس پر گرم گرم بحثیں ہونے لگیں، گفتگو ایسی آزادی کے ساتھ ہوتی تھی کہ اس میں اشخاص کا امتیاز بھی روا نہیں رکھا جاتا تھا کیونکہ علم سے بالاتر کوئی چیز بھی نہیں ہو سکتی۔

تابعین میں سے ایک بزرگ "زید بن اسلم" مسجدِ نبوی میں لوگوں کو علمی درس دیا کرتے تھے۔ یہ بزرگ ایک آزاد شدہ غلام تھے لیکن ساتھ ہی علوم و فقہ میں مہارتِ کاملہ کے مالک تھے۔ ایک معلم ہونے کی حیثیت سے بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اکثر فقہ کا درس دیتے علی بن حسین بکثرت ان ہی کے حلقۂ درس میں شریک رہتے۔ ایک روز نافع بن جبیر سے، علی بن حسین کی ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگے، "تعجب ہے تم پر! تم سیدزادے اور مخلوق میں افضل ترین ہوتے ہوئے اس غلام کی مجلس میں جا کر بیٹھتے ہو؟"

علی بن حسین بولے: "نافع! علم کی کوئی مقررہ منزل نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ جہاں کہیں بھی ہو اس کی خاطر پہنچنا (۹) چاہیئے۔" نافع کچھ نہ بولے، گویا ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، اور جواب نہایت معقول معلوم ہوا۔ حقیقت میں علی بن حسین اپنے عمل و کردار سے علم اور ذکوانی (غلام) دونوں کی قدر و منزلت میں اضافہ کے خواہشمند تھے۔

علی بن حسین کی یہ علمی جستجو کبھی کم نہ ہوئی۔ اسی جذبہ کاوش نے ان کو یکتائے روزگار بنایا اور علوم فقہ، قضا اور دانشمندی میں بے نظیر مقام بخشا، وہ نہ صرف اہل علم ہی تھے، بلکہ عمل میں بھی سراپا نمونۂ رسول تھے، عبادت کا یہ حال تھا کہ رات دن میں ہزار ہزار رکعتیں نوافل پڑھتے تھے، نوافل کے دوران، گریہ وزاری، انابت الی اللہ اور دعا میں مشغول رہتے تھے۔ گھر والے بعض اوقات ان کی عبادت کی تقلید کرنا چاہتے مگر عاجز رہتے۔ علی بن حسین ان کو آرام کرنے اور ہمت سے زیادہ مشقت میں پڑنے سے باز رہنے کی فہمائش کرتے ہوئے فرماتے: "اپنی عادت و ہمت سے زیادہ خود کو گراں بار نہ کرو، ورنہ مشقت میں پڑ جاؤ گے۔"

عبادت و زہد میں چونکہ ان کی کوئی نظیر نہ تھا لہذا لوگوں نے انھیں "زین العابدین" کے لقب سے پکارا۔ ان کی پیہم سجدہ ریزیوں کو دیکھتے ہوئے ان کو "سجاد" کہا، سجدوں کا نشان ان کی پیشانی پر چمکا تو "ذوالثفنات" کہا گیا۔ ان کی کنیت "ابن الخیرتین" (۱۰) تھی کیونکہ والد کے واسطے سے ان کی ددھیال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور ننھیال ایران کے شاہی خاندان سے ملتی تھی، اس کے علاوہ "سید العارفین" "الزکی الامین" القاب اور ابوالحسن، ابوبکر، ابومحمد ان کی کنیتیں تھیں۔

برکت حاصل کرنے کے لئے لوگ ان کے پاس آتے اور نیک شگون سمجھتے ہوئے ان کے ہاتھوں کو چھوتے۔ مسجد نبوی میں لوگ ان کو دیکھنے کے لئے آتے۔ نماز سے

فراغت کے بعد آگے بڑھ کر ان کے ہاتھوں کو چومتے اور آنکھوں کو لگاتے۔ ان کا یہ اعتقاد
تھا کہ جس چہرے کو زین العابدین کے ہاتھ چھو لیں وہ کبھی بوڑھا نہیں ہو سکتا۔ نہ اُسے
کبھی آشوب چشم یا آنکھوں میں دوسری کوئی تکلیف پیدا ہو سکتی ہے۔ (۱۱)

پرانی تہذیب کے اثرات غلاموں اور کنیزوں کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھے جس
نظر سے شرفا اور احرار دیکھے جاتے تھے وہ ان غریبوں کو نصیب نہ تھی۔ اہلِ علم، اہل الرائے
اور آزاد ہو جانے کے باوجود بھی اُن کو آزاد لوگوں کی طرح عزت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا
تھا۔ حضرت زین العابدین نے دیکھا کہ مدینہ والے حتیٰ کہ وہاں کے اہلِ علم اور محدثین بھی ان کے
بارے میں انصاف سے کام نہیں لے رہے ہیں۔ انھوں نے ان اہلِ علم، فصحاء اور محدثین، غلاموں
اور مولاؤں کی مجلسوں میں صبح و شام حاضری دی۔ اس کا مقصد حصولِ علم کے علاوہ ان کی حوصلہ
افزائی بھی تھی۔ (۱۲)

اہلِ مدینہ امہاتِ اولاد اور باندیوں کو عزت کی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے لیکن حقیقت
یہ تھی کہ صرف مدینہ ہی میں تین ایسی باکمال عظیم ہستیاں تھیں کہ عراق، حجاز اور مدینہ میں ان کی
نظیر نہ ملتی تھی یہ تینوں باندیوں (۱۳) کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے، یہ تھے سالم بن عبداللہ
بن عمر، قاسم بن محمد بن ابی بکر اور علی بن حسین زین العابدین، یہ سب خالہ زاد بھائی اور یزدجرد
کی لڑکیوں کی اولاد تھے۔ لیکن ان کی پرہیزگاری اور [illegible] کا یہ حال تھا کہ ان کو تمام اہلِ مدینہ پر فوقیت
حاصل تھی چنانچہ اہلِ مدینہ نے باندیوں سے شادیاں کرنی شروع کیں کہ شاید ان کو بھی اس قسم
کی اولاد نصیب ہو جائے۔ (۱۴)

سعید بن المسیب اپنے زہد، علم، عقل اور بلا کی ذہانت کے باوجود باندیوں کی اولاد
سے بھی اسی طرح پیش آتے تھے جس طرح وہ آزاد عورتوں کی اولاد سے ملتے تھے۔ حتیٰ

کہ جب یہ تین باندی زادے بڑی عمروں کو پہنچ کر لوگوں کے سردار بن گئے تو دیکھا گیا کہ قریش میں سے ایک نوجوان ان کی مجلس میں علم و فقہ حاصل کرنے کے لیے پہنچا، مگر اس کی ماں باندی تھی۔ سعید نے ایک روز اس نوجوان سے تعارف حاصل کرنے کے لیے پوچھا: "تمہارے ننھالی خاندان والے کون لوگ ہیں؟" قریشی نوجوان نے جواب دیا، "میری ماں کنیز ہے۔"

سعید بن مسیّب سے قریشی نوجوان نے جب یہ ظاہر کیا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ سعید کی نظروں میں معمولی حیثیت کا آدمی سمجھا گیا ہے چنانچہ سعید نے اس کی جانب سے منہ پھیر لیا اور کوئی خاص توجہ نہ دی۔ نوجوان کو سعید کا یہ سلوک بہت ناگوار گزرا، اس نے سعید کو قابل اعتناء سمجھا، کوئی بات نہ کی، اور سعید اس درمیان میں وہاں سے جلنے لگے۔

سعید ابھی اٹھ ہی رہے تھے کہ سامنے سے سالم بن عبداللہ بن عمر نمودار ہوئے سعید نے ان کی بہت مدارات کی، تپاک سے ملے، عزت کے ساتھ بٹھایا، کچھ دیر گفتگو رہی اور سالم وہاں سے رخصت ہو گئے۔ جب وہ جا چکے، تو قریشی نوجوان نے ابن المسیب سے کہا، "چچا! یہ کون صاحب تھے جن سے آپ اس قدر تپاک سے ملے؟" سعید نے جواب دیا: "سبحان اللہ! کیا تم اپنی قوم کے اس جیسے ہیرو سے بھی ناواقف ہو؟ یہ سالم بن عبداللہ بن عمر بن خطاب تھے۔" قریشی نے پوچھا، "ان کی والدہ کون تھیں؟" سعید نے کہا، "ان کی والدہ کنیز تھیں۔"

قریشی خاموش ہو گیا اور کوئی جواب نہ دیا سعید بھی خاموش ہو گئے۔ اسی عرصہ میں قاسم بن محمد بن ابی بکر بھی تشریف لے آئے۔ سلام کیا، ان سے بھی سعید نے ادب احترام سے پیش آئے اور کچھ دیر کے بعد وہ بھی رخصت ہو گئے۔ نوجوان نے پھر سوال کیا، "چچا! یہ کون تھے؟" سعید بولے، کیا تم اپنی قوم میں سے قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق جیسے شخص سے بھی ناواقف ہو؟" قریشی نے کہا: "میں ان کے والد کے متعلق تو جانتا ہوں لیکن یہ بتائیے کہ ان کی والدہ

کون تھیں"؟ سعید نے جواب دیا۔ "ان کی والدہ کنیز تھیں۔"

کچھ دیر نہ گزری تھی کہ سید السجاد، زین العابدین علی بن حسین تشریف لائے۔ سعید کہا کرتے تھے، "میں نے علی بن حسین سے افضل ترین انسان عمر بھر نہیں دیکھا۔ میں جب بھی انھیں دیکھتا ہوں تو خود پر حقارت آمیز نظر (۱۵) ڈالتا ہوں"۔ ——— غرض سعید نے جب علی بن حسین کو آتے دیکھا، تو تعظیماً کھڑے ہو گئے، نہایت احترام و تکریم سے پیش آئے۔ پاسِ ادب سے گفتگو بھی پورے اجلال و احترام سے کرتے رہے، حتیٰ کہ امام زین العابدین بھی تشریف لے گئے۔ قریشی نے پھر اپنا سوال دہرایا، "چچا! یہ کون صاحب تھے"؟ سعید نے اس قریشی کی ناواقفیت اور جہالت پر ناگواری کے انداز میں جواب دیا، "یہ وہ ہستی ہے۔ جس سے کسی مسلمان کو بھی ناواقف نہیں ہونا چاہیئے! یہ تھے علی بن حسین بن علی بن ابی طالب!"

قریشی نے کہا، "میرا سوال ان کے والد کے متعلق نہیں۔ والدہ کے متعلق ہے"۔ سعید ایک ہی قسم کے مسلسل سوال کرنے سے نوجوان کے مقصد کو بھانپ گئے۔ جواب میں قدرے مسکراہٹ بھی، "ان کی والدہ کنیز تھیں۔"

قریشی نوجوان نے کہا، "چچا! میں نے آپ کے سوال کے جواب میں یہ عرض کیا کہ میں کنیز زادہ ہوں تو اس وقت میں نے محسوس کیا کہ میں آپ کی نظروں میں حقیر ہو گیا ہوں۔ کیا میرا معاملہ بھی ان تینوں بزرگوں کے مشابہ نہیں ہے؟" یہ سن کر سعید احساسِ ندامت سے کچھ بوجھل سے ہو گئے۔ اس کے بعد اس نوجوان سے پوری توجہ اور عنایت سے پیش آنے لگے، نوجوان اب محسوس کر رہا تھا کہ اب وہ سعید کی نگاہ میں قدر و منزلت کا مالک (۱۶) ہو گیا ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ ان تین کنیز زاد عظیم انسانوں کے فضل و شرف کے مقام کو لوگوں نے

اس قدر اونچا پایا کہ مدینہ میں اُن کو ان تینوں سے کوئی شخص بھی بلند تر نظر نہ آیا۔ اس طرح گویا حریت اور غلامی کے پلڑے برابر ہو گئے تھے بلکہ کہنا چاہیئے کہ غلاموں کا پلڑہ آزادوں سے بھی وزنی ہو گیا تھا۔ اس صورتِ حال میں اسلام نے لوگوں کو عجیب کشش کے ساتھ علم کا راغب بنا دیا تھا۔ مدینۃ الرسول میں مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں میں کوئی ایسا نہ تھا جس کے پاس ان علمی چشموں کا فیض نہ پہنچا ہو اور وہ اپنے اس علم پر فخر نہ کرتا ہو۔

زین العابدین فقہ میں مرجعِ انام تھے۔ ان کے تہ خانۂ دماغ میں گویا علوم فقہی کے انبار لگے ہوئے تھے وہ تمام اہلِ مدینہ میں سب سے بڑے فقیہ شمار ہوتے تھے۔ بڑے بڑے فقہاء کا ان کی طرف عام رجوع تھا۔ مختلف قسم کے معاملات پر اس وقت ان کے پاس استفتاء لایا جاتا تھا۔ جبکہ فقہائے وقت سے ان کا جواب نہ بن پڑتا تھا چنانچہ اہلِ مدینہ میں وقت کے زبردست فقیہ سعید بن المسیب تفقہ اور استفتاء میں اُن سے استفادہ کرتے تھے۔

عجیب معاملہ تھا کہ جب کسی مسئلہ پر فقہائے مدینہ جچی تلی بات کہنے میں قاصر ہو جاتے تو زین العابدین کی اس میں دو ٹوک پختہ رائے ہوتی۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ مشہور امام حدیث و روایت، محمد بن مسلم عبید اللہ بن شہاب زہری دریائے جیحوں کے کنارے شام کے ایک سرحدی مقام مصیصہ میں عبدالملک بن مروان سے ملنے گئے۔ اس مقام کو اس نے عہد قریب ہی میں فتح (۱۷) کیا تھا۔ یہ انطاکیہ اور بلادِ روم کے درمیان طرسوس (۱۸) کے قریب ہی واقع تھا، عبدالملک یہاں پہلی مرتبہ وارد ہوا تھا اور وہاں کے مرغزاروں اور گھنے باغات سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

عبدالملک علم حدیث میں نہ صرف دلچسپی بلکہ اس علم میں خاصا درک رکھتا تھا۔ کبھی کبھی اوقاتِ فرصت میں اس علم میں مذاکرہ بھی کرتا تھا تاکہ اس کی واقفیت میں اضافہ ہو۔ عبدالملک اپنے

شاہی محل میں فروکش تھا۔ دربار اور صدر دروازہ کے درمیان کئی ڈیوڑھیاں تھیں اور ان پر حاجبوں اور فوج کا سخت پہرہ تھا۔ یہ ڈیوڑھیاں باریابی پانے والوں کے واسطے انتظار کا وقت گزارنے کے لئے قیمتی قالینوں سے آراستہ تھیں۔ دربار سے صدر دروازہ کا کافی فاصلہ تھا جب کوئی شاہی فرمان کسی سے متعلق صادر ہوتا تو کافی مرحلوں سے گزر کر صدر دروازے تک پہنچتا۔ براہِ راست (۱۹) وہاں سے دربار کی کوئی بات نہ سنی جا سکتی تھی اور نہ بغیر اذن کے وہاں تک کسی کو باریابی ہو سکتی تھی۔ علمائے حدیث میں سے مختلف علماء ان ڈیوڑھیوں میں حسب مراتب اس کثرت سے بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کا یہ سلسلہ صدر دروازہ تک پہنچتا تھا۔ بادشاہ کی طرف سے ایک علمی سوال اٹھایا گیا جو تمام محدثین سے منتقل ہوتا ہوا دروازہ تک پہنچا۔ اس سوال پر زہری کے جواب کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ بادشاہ تک جب یہ جواب پہنچا تو اُسے پسند آیا اور جواب دینے والے کو دربار تک پہنچنے کی اجازت نصیب ہوئی۔ زہری دربار میں پہنچے، کچھ دیر قیام کیا اور بہت سے مال کے ساتھ جو بطور انعام ملا تھا واپس ہوئے۔

پھر انھیں مدینہ لوٹ جانے کی اجازت مل گئی تو وہ مدینہ کے لئے روانہ ہو گئے، ہمراہ ان کے ایک غلام تھا۔ روانہ ہوتے وقت انھوں نے انعام میں ملا ہوا مال ایک تھیلے میں بند کر کے غلام کے حوالہ کر دیا چونکہ مسافت کافی لمبی تھی۔ راستہ میں کسی منزل پر مال والا تھیلا دیکھا گیا تو وہ نہ ملا کیونکہ وہ کہیں گم ہو چکا تھا۔ زہری کو غلام پر شبہہ ہوا۔ بہت کچھ ڈرایا دھمکایا، اس سے کہا گیا کہ اگر اس نے اقرار کر لیا تو نہ صرف یہ کہ انعام دیا جائے گا بلکہ آزاد بھی کر دیا جائے گا لیکن اگر انکار کرے گا تو پھر سخت سزا دی جائے گی۔ لیکن غلام نے صاف انکار کر دیا اور برابر انکار ہی کرتا رہا۔ زہری کو اس پر بہت غصہ آیا اس کو نیچے ڈال کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے اور اپنی کہنی سے اس کے چہرے کو روندنے لگے لیکن اس نے اب بھی اقرار نہ کیا۔ زہری

نے اس کو مجبور ہو کر چھوڑ دیا اور ارادہ کیا کہ اس کو معاف کر دیا جائے تاکہ کم از کم غلام تو اپنے قبضے میں رہے، کیونکہ مال سے انھیں مایوسی ہو چکی تھی۔

زہری اس کے سینے سے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن حیران تھے، کہ غلام نہیں اٹھا، اس کو ہاتھ سے کھینچا۔ پاؤں سے ٹھوکر لگائی، سر کو حرکت دی، لیکن غلام نے حرکت تک نہ کی۔ اس کو جھک کے دیکھنے لگے۔ کانوں میں چیخ کر پکارا۔ سانس کی آمد و رفت معلوم کی، معلوم ہوا کہ نہ وہ سن رہا ہے، نہ سانس لے رہا ہے۔ غلام مر چکا تھا! زہری کا ارادہ ہرگز یہ نہ تھا کہ غلام کو ہلاک کیا جائے۔ کیونکہ اس سے انھیں بہت آرام ملتا تھا۔ زدو کوب صرف مال کی وجہ سے کیا تھا تاکہ وہ مال کا اقرار کر لے، لیکن ان کا دوہرا نقصان ہو چکا تھا۔ مال بھی گیا اور غلام بھی مر گیا۔ اس طرح زہری سے ایک زبردست غلطی اور بھاری جرم کا ارتکاب ہو گیا۔

زہری صالح و دین دار آدمی تھے، دل کو اضطراب و تردد ہوا۔ اس گناہ کی تلافی کے لئے سخت ادھیڑ بُن میں مبتلا ہو گئے۔ بہت کچھ سوچا لیکن سمجھ میں نہ آیا کیوں کہ غلام اُن کی ملک تھا۔ اگر کوئی اور شخص ان کے ہاتھ سے ہلاک ہو گیا ہوتا تو یقیناً اُن پر قتلِ خطا یا قتلِ شبہ عمد کی دیت لازم ہو جاتی لیکن چونکہ وہ ان کی ملک تھا اسلئے اس کی دیت کے بھی وہی شرعاً حق دار تھے۔ گویا زہری پر تلافی کا دروازہ بند تھا۔ نہ کوئی توبہ تھی اور نہ کفارہ!

زہری نے مدینہ کے فقہاء اور حفاظِ حدیث کی طرف رجوع کیا۔ وہ فوراً سعید بن المسیب کے پاس پہنچے اور واقعہ سنایا۔ سعید نے فرمایا (مجھے تمہارے لئے توبہ کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی کیوں کہ اس کی دیت تم پر واجب نہیں وہ خود تمہاری ملک اور تمہارا غلام تھا۔ تم پر کوئی شرعاً مواخذہ نہیں) اس جواب سے زہری کو تسلی نہ ہوئی، وہ دوسرے فقہا میں سے ایک ایک کے پاس پہنچے، ابو عبدالرحمن، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد بن ابی بکر، سالم بن عبداللہ بن عمر، سب کو اپنی

داستان سنائی تو سب نے یکے بعد دیگرے یہی کہا، تمہارے لئے توبہ کی کوئی صورت ہمیں نظر نہیں آتی۔ ان حضرات نے بھی سعید بن المسیّب کی طرح دیت کو ناواجب قرار دیا)

زین العابدین کو یہ تمام قصہ، زہری کا استفتاء اور فقہاء کا جواب معلوم ہوا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ زہری کے دل کو اس جواب سے شرحِ صدر اور تسلی نہیں ہوئی۔ فرمایا، "زہری کو میرے پاس لاؤ"۔ زہری حاضر ہوئے اور تمام واقعہ سنایا۔ زین العابدین نے فرمایا، "میرے خیال میں تمہارے اس جرم کی توبہ کی ایک صورت ہے (تم کسی مسلمان غلام کو آزاد کرو، یا مسلسل دو مہینے کے روزے رکھو"۔ (۲۰)

زین العابدین کے اس فیصلہ کے مطابق زہری نے عمل کیا۔ ان کی تمام کاوشیں اور قلبی پریشانیاں ختم ہوگئیں۔ دیگر فقہاء نے یہ جواب سنا تو سب نے تسلیم کیا اور اس پر کوئی کلام نہیں کیا۔ زہری وہاں سے یہ کہتے ہوئے نکلے، "میں نے زین العابدین سے بڑھ کر کوئی فقیہ نہیں دیکھا"۔

---

(۱) اعیان الشیعہ جلد ۴ صفحہ ۴۸۱

(۲) الصحیفۃ الخامسۃ السجادیہ، صفحہ ۴۹۱

(۳) اعیان الشیعہ جلد ۴ صفحہ ۳۴۱

(۴) زینب، صفحہ ۶۱

(۵) الصحیفۃ الخامسۃ صفحہ ۱۱۶

(۶) " " " ۱۰۳

(۷) کتاب الخراج لابی یوسف صفحہ ۶۲

(۸) کتاب الخراج لابی یوسف، صفحہ ۴۹

(۹) الصفوہ جلد ۲، صفحہ ۵۵

(۱۰) الکامل للمبرد، جلد ۱، صفحہ ۳۱۱

(۱۱) دائرۃ المعارف لبستانی، جلد ۹، صفحہ ۳۵۵

(۱۲) اعیان الشیعہ جلد ۴، صفحہ ۴۱۹

(۱۳) الاسلام والحضارۃ، صفحہ ۱۰۰

(۱۴) وفیات الاعیان جلد ۱، صفحہ ۵۷۶

(۱۵) تاریخ الیعقوبی جلد ۳، صفحہ ۴۶

(۱۶) الکامل للمبرد، جلد ۱، صفحہ ۳۱۱ و وفیات الاعیان، جلد ۱، صفحہ [illegible] ۵۰

(۱۷) مصیصہ ۸۴ھ میں فتح ہوا۔ تاریخ الخلفاء، صفحہ ۱۴۴

(۱۸) معجم البلدان، جلد ۸، صفحہ ۸۰

(۱۹) عبد الملک پہلا بادشاہ تھا جس نے یہ حکم دیا تھا کہ دربار میں بادشاہ سے پہلے کوئی گفتگو نہ کرے۔ تاریخ الخلفاء، صفحہ ۱۴۵

(۲۰) یہ تمام واقعہ عقد الفرید (جلد ۴، صفحہ ۳۸۶) میں نقل کیا ہے لیکن صاحب عقد الفرید کہتا ہے "کہ زین العابدین نے زہری سے فرمایا، تم دو ماہ کے مسلسل روزے رکھو، ایک غلام آزاد کرو، اور ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔ علاوہ ازیں صاحب الحقائق (صفحہ ۱۰۴) نے زہری کے دیگر کچھ قضایا اور زین العابدین کے اس پر جوابات بھی درج کئے ہیں۔ ہم نے اس مذکورہ مسئلہ میں کتب فقہ کی طرف رجوع کیا اور صرف شبہہ قتل عمد کے حکم کے بیان پر اکتفا کیا۔ مسئلہ کی اس ترتیب میں غالباً صاحب عقد الفرید سے وہم یا غلطی ہوگئی، کیونکہ انھوں نے اطعام مسکین کو بھی بیان کیا ہے حالانکہ کفارۂ قتل میں اطعام مسکین نہیں ہے۔

آزاد غلاموں کا میلہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے طائف والے دن، ایک منادی نے پکار کر کہا "جو غلام ہاتھ آئے گا، وہ آزاد ہے اور اس کی ولاء، اللہ اور رسول کے لئے (۱) وقف ہوگی۔"

بدری صحابی ابومسعود اپنے ایک مملوک غلام کو کوڑے سے سخت سزا دے رہے تھے۔ غصہ اس قدر شدید تھا کہ یکے بعد دیگرے پیہم کوڑے برسا رہے تھے۔ غلام فریاد کے لیے چیخ رہا تھا مگر کوئی اس کی طرف دھیان نہ دیتا تھا جس وقت وہ مار رہے تھے پیچھے سے کسی کہنے والے کو سنا کہ کہتا ہے، "ابومسعود، سنو!"

ابومسعود نے آواز سنی، لیکن انھوں نے کوئی امتیاز نہیں کیا کہ یہ کس کی آواز ہے کیونکہ غصہ نے گویا ان کے احساسات کو ختم کر دیا تھا۔ یہ آواز برابر قریب اور بلند ہوتی گئی، آواز تھی،.....
"ابومسعود، سنو!"

ابومسعود نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ اس وقت وہ آواز ان سے بالکل قریب آچکی تھی۔ ابومسعود دیکھ کر سراسیمہ ہو گئے اور خوف و ہیبت سے لرز اٹھے۔ کوڑا ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ سر جھکا کر کھڑے ہو گئے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، فرما رہے تھے، "ابومسعود سنو، ابومسعود سنو!"
ابومسعود نے جب سر جھکا لیا اور رعب و جلال سے سراسیمہ کھڑے رہ گئے، تو آنحضرت نے ارشاد فرمایا، "ابومسعود یاد رکھو! اس غلام پر تمھارا جس قدر بس چلتا ہے، خداوند تعالیٰ کا اس سے بھی

زیادہ تم پر بس چلتا ہے ! " ابو مسعود شرم سے پسینہ پسینہ ہو گئے۔ اپنے اس گناہ کا کفارہ دینا چاہا،
توبہ کی اور عرض کیا ، یارسول اللہ ، یہ غلام اللہ کے لئے آزاد ہے۔
آنحضرت نے ارشاد فرمایا :۔
" اگر تم اس کو آزاد نہ کرتے تو یقیناً جہنم کی آگ تم کو جھلس کر (۲) رکھ دیتی۔

جنگی فتوحات کے نتیجہ میں اموالِ غنیمت کے ساتھ سینکڑوں بلکہ ہزاروں غلام اور کنیزیں مدینہ میں لائی جارہی تھیں۔ گویا غلاموں کی فوج زمین سے ابل رہی تھی۔ کوئی اطلاع یا ڈاک نہ تھی جو جنگی محاذ سے روانہ ہو رہی ہو اور اس کے ساتھ قیدی غلاموں کو نہ بھیجا جارہا ہو۔ یہی غلام اور کنیزیں بالآخر مہاجرین و انصار اور ان کی اولاد میں اموالِ غنیمت کے ساتھ بطور تحفہ مستحقین میں تقسیم کر دیئے جاتے تھے۔ مدینہ ایک بازار میں تبدیل ہو گیا تھا جس میں تحفہ دینے یا تجارت کے لئے ان غلاموں کا ہجوم رہتا تھا۔ زین العابدین غلاموں کو دیکھتے انھوں نے کثرت سے غلام خریدے ، ان سے وہ اپنے کاموں میں خدمت لیتے۔ ان پر انعام و عطا کی بارش کرتے ، حتیٰ کہ جب آزادی دینے کا وقت آتا تو ان کو آزاد کر دیتے۔ ان کی آزادی کا وقت ان کے لئے قریب ہی رہتا۔ کچھ زیادہ مدت نہ گزرتی کہ غلام ان کے گھر میں خریدا ہوا ہونے کی حیثیت سے داخل ہوتا اور دو ہری دولتوں سے مالا مال ہو کر گھر سے نکلتا۔ ایک دولت آزادی اور دوسری دولت اسلام۔

زین العابدین نے غلاموں کی اس خرید پر بے شمار مال خرچ کیا۔ ان کی آمدنی بڑی زبردست تھی۔ وہ اپنے والد کے ترکہ میں زمین کے وارث ہوئے تھے۔ مال غنیمت میں ان کو حصہ ملتا تھا۔ زمین میں کاشت کراتے تھے اور زمینوں کے چشموں سے پانی کے (۳) ذریعہ آمدنی میں اضافہ کرتے۔ علاوہ ازیں تجارت پر بہت سے کارندے ملازم تھے۔ جو حجاز و

نجد کی پیداوار اونٹوں کے ذریعہ شام میں لے جاکر فروخت کرتے اور شام کے غلّے اور پھلوں سے اونٹوں کو بھر کر حجاز میں لاکر فروخت کرتے تھے۔ (۴)

زین العابدین کا معمول تھا کہ وہ غلاموں اور مسکینوں کو کھلاتے۔ صدقہ و خیرات کرتے، رحم و عفو سے کام لیتے، چند ہی دنوں غلاموں کے مالک بنتے اور بالآخر انھیں آزاد کر دیتے، یہ وہ فضیلت تھی کہ ان کا مقابلہ کرنے کی کسی میں یہ طاقت نہ تھی۔ عام عادت یہ تھی کہ کنیزوں اور غلاموں کی لغزشوں کو معاف کرنے اور بالآخر آزاد کر دینے کا باعث ٹھیرایا جائے، ان کے علاوہ کون ایسا کرنے پر تیار ہو سکتا تھا کہ غلام یا کنیز کی لغزش اور بیہودگی کو اس کی آزادی اور اس پر احسان کرنے کا ذریعہ قرار دیا جائے۔

ان خدمتگار غلاموں میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو ایک سال سے زیادہ ان کی خدمت میں مشغول رہا ہو اور پھر زین العابدین نے اس کو اس کی آزادی اور ولاء دونوں چیزیں نہ بخشدی ہوں۔ (اس کام کے لئے ان کے ہاں ایک باقاعدہ رجسٹر تھا جس میں غلاموں کی لغزشوں کا اندراج اور شمار ہوتا تھا، اور جب رمضان کی آخری رات یعنی شب عید الفطر آتی تو ان تمام کو طلب فرماتے وہ یہ رجسٹر کھولتے اور ایک ایک کرکے ان کی غلطیوں کو شمار کراتے، اس کے بعد ان سے فرماتے کہ اپنی ان غلطیوں کا اعتراف کرو، جب وہ اعتراف کرتے تو فرماتے کہ قبلہ رو ہو کر خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں دعا کرو، "اے اللہ! علی بن حسین کے گناہوں کو معاف کر۔" جب وہ سب یہ دعا مانگ چکتے تو ان کو پروانۂ آزادی بخشتے، اس کے علاوہ ان کو عید کے لئے اور زندگی کی گزران کے لئے جس قدر ضرورت ہوتی وہ بھی بخشتے)

دیگر غلاموں کو یہ باتیں معلوم ہوئیں تو وہ کوشش کرنے لگے کہ اپنے مالکوں کے ہاتھوں سے نجات پاکر کسی طرح زین العابدین کی ملک میں چلے جائیں۔ غرض زمانہ یوں ہی

کروٹیں لیتا رہا۔ صبح و شام گزرتے رہے اور زین العابدین ہر سال ہر ماہ اور ہر روز غلاموں کی لغزشوں اور خطاؤں پر حریت کو عام کرتے رہے۔ حتیٰ کہ مدینہ میں آزاد شدہ غلاموں اور کنیزوں کی ایک زبردست فوج ہو گئی۔ یہ تمام زین العابدین کے آزاد کردہ تھے جن کی تعداد پچاس ہزار سے بھی متجاوز تھی (۵)

علی بن حسین، مشرق و مغرب میں، لوگوں کی گفتگو اور تذکروں میں ایک بہترین موضوع کی حیثیت سے یاد کئے جاتے تھے۔ ان کے اس شہرہ کو کوئی دیوار نہ روک سکتی تھی اور نہ کوئی فوج۔ وہ تمام اسلامی بلاد میں ایک مثالی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کے تمام گھر ان کی خوبیوں کے ترانے گا رہے تھے۔ ہر صاحب دل کی یہ خواہش تھی کہ ان کو اپنی موت سے پہلے کم از کم ایک بار ضرور جی بھر کر دیکھ لے۔ ایام حج میں وہ عام لوگوں کے میزبان ہوتے۔ لوگ ان کے دستر خوان پر رنگ برنگ کے کھانوں کے علاوہ ان کی زیارت کے بھی مشتاق ہوتے اور جب زیارت کرتے تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ وہ ان کے قصوں اور باتوں سے اپنے دل و دماغ بھر لیتے اور پھر شوق و بہار کے ساتھ اپنے گھر والوں کو جا کر سناتے۔

یہ حال اہل بیت، اہل مدینہ، غلاموں اور کنیزوں سب ہی کا تھا۔ ایام حج کی راتوں میں وہ یہ باتیں غور سے سنتے، اور پھر سب کو سناتے۔ کوئی اپنی جماعت میں سناتا اور کوئی اس منزل کے مسافروں کو جہاں وہ نزول و قیام کرتا تھا سناتا۔ اس طرح یہ اوصاف حمیدہ تمام دنیائے اسلام میں پھیل چکے تھے۔ ہر ایک داستان گو کے واقعات میں جاذبیت کے رنگ بھرے ہوئے تھے۔

حسن بن حسن فرماتے ہیں، میرے اور زین العابدین کے درمیان بعض معاملات میں اختلاف ہوا۔ میں ان کے پاس گیا۔ وہ اس وقت مسجد نبوی میں کچھ لوگوں کے ہمراہ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے غصہ میں باتیں کرنا شروع کیں تو کہنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ زین العابدین خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ میں

واپس چلا آیا۔ رات کے وقت کسی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا، میں اٹھ کر دروازے پر پہنچا تو دیکھا، زین العابدین کھڑے ہیں۔ ان کے اس وقت اچانک پہنچنے پر میں نے دل میں قطعی طور پر یہ رائے قائم کی کہ وہ مجھے سخت سست کہنے اور دن کی گفتگو کے جواب میں میری تردید کرنے آئے ہیں۔ لیکن انھوں نے فرمایا، "بھائی! جو کچھ تم نے کہا اگر واقعی تم اس میں سچے ہو، تو خدا میرے گناہ معاف فرمائے اور اگر تم سچے نہیں ہو تو خدا تمہارے گناہ بخشے!" اس کے بعد سلام کیا، اور واپس چلے گئے۔

مجھے ان کے چلے جانے پر افسوس ہوا، بلکہ یہ افسوس میرے افکار و شعور پر چھا گیا۔ میں فوراً ان کے پیچھے پیچھے دوڑا، اور پیچھے سے ان کے کپڑے پکڑ کر کھینچتے ہوئے رو کر کہا، ان کا دل بھی میری اس حالت پر بھر آیا تھا، وہ ٹھہر گئے، میں نے عرض کیا، "بھائی جو کچھ ناگوار باتیں میں نے کہیں وہ مجھ سے غصہ میں نکل گئی تھیں!" فرمایا "تم نے جو کچھ کہا، وہ میں تمہارے لئے حلال (۶) قرار دیتا ہوں۔"

اہل مدینہ میں سے ایک شخص راوی ہے، کہ ایک مرتبہ زین العابدین سے میری ملاقات مسجد نبوی سے باہر ہوئی۔ میں گفتگو میں اس قدر بہکا کہ ان کی شان میں گستاخی کرنے لگا۔ میں نے ان کو کافی برا بھلا کہا۔ اب سوچتا ہوں تو کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی کہ میں نے ایسا کیوں کیا تھا؛ غرض میری اس گستاخی پر غلام اور موالی مجھے پکڑ لینے کے لئے آگے بڑھے، حقیقت یہ ہے اگر وہ مجھے جھپٹ جاتے تو میری تکا بوٹی کر دیتے، لیکن علی ابن حسین نے ان کو ڈانٹتے ہوئے فرمایا "خبردار جو اس شخص کو ہاتھ لگایا۔" وہ یہ سن کر پیچھے ہٹ گئے۔ (۷)

میں اس صورت حال سے گھبرا گیا، ایک قدم بھی نہ اٹھا سکا۔ خاموش کھڑا رہ گیا۔ زین العابدین اور ان کے غلام آگے بڑھے، پھر زین العابدین مسکراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر بولے "گھبراؤ نہیں، دل مضبوط رکھو۔"

پھر فرمایا "تم نے ہمیں جو کچھ کہا وہ اسی قدر ہے جو تمھیں معلوم ہے لیکن ہمارے اندرونی حالات اس سے بھی زیادہ خراب ہیں!" پھر مجھ سے فرمایا "تمھیں کوئی ضرورت ہو تو بتاؤ، ہم تمھاری مدد کریں گے،" مجھے ان کی اس بات پر سخت شرم آئی۔ انھوں نے مجھے شرماتے دیکھ کر اپنی سیاہ دھاری دار چادر اتاری اور مجھے اڑھادی اور حکم دیا کہ اسے ایک ہزار درہم پہنچا دیئے جائیں۔ اس کے بعد میری یہ حالت تھی کہ جب بھی ان کو دیکھتا تو کہتا، میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً آپ رسول اللہ کی اولاد میں سے ہیں۔" (۷)

ایک مرتبہ آزاد شدہ غلاموں میں ماضی کے واقعات پر تبصرہ ہونے لگا تو ایک نے کہا: میں علی بن حسین کا غلام تھا، انھوں نے مجھے ایک کوڑا مارا، قصہ یہ ہوا کہ مجھے کسی کام کے لیے بھیجا گیا تھا۔ میں نے وہاں دیر کردی اور جب پہنچا تو یہ سزا ملی، میں رونے لگا، دل بھر آیا کیونکہ میرا خیال تھا کہ وہ کبھی کسی کو نہیں مارتے۔ میں نے کبھی ان کو کسی کو سزا دیتے نہ دیکھا تھا حتیٰ کہ وہ اپنی اس اونٹنی کو بھی نہ مارتے تھے جس پر وہ حج کرتے تھے۔ اگر کبھی وہ اونٹنی شرارت کرنے لگتی تو اس سے اتر جاتے۔ اس کو کوڑے سے ڈراتے اور پھر آرام سے گھومنے دیتے۔ کچھ دیر بعد اس کے پاس آتے اور سوار ہو جاتے (۸) غرض جب مجھے غصہ آیا تو میں نے کہا، علی بن حسین! خدا سے ڈرو، تم مجھے اپنے کام کے لئے بھیجتے ہو اور پھر مارتے ہو! یہ الفاظ سنکر میرے آقا رو پڑے، اور مجھ سے فرمایا "جاؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ کے قریب جاکر دو رکعت پڑھو اور دعا کرو کہ الٰہی! علی بن حسین کی مغفرت فرما، اگر تم گئے اور ایسا ہی کیا تو تمھیں اللہ کے لئے آزاد کرتا ہوں۔" میں گیا، دوگانہ ادا کیا اور دعا مانگی، واپس لوٹا تو میں آزاد تھا (۹)"

دوسرے غلام نے اپنا واقعہ سنایا، "میں اس واقعہ کی نسبت زیادہ سنگین جرم میں پھنسا اور آزاد ہوا، میں اُن کا غلام تھا اور ان کی ایک زمین پر نگران تھا۔ وہ ایک روز میرے پاس تشریف لائے زمین میں نہایت بدنظمی، پراگندہ حالی اور تباہی دیکھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ تمام صورت میری غفلت سے ہوئی تھی۔ میری اس کوتاہی کو دیکھ کر زین العابدین بہت ناراض ہوئے، ان کے ہاتھ میں کوڑا تھا مجھے اس سے مارا اور مجھے وہیں چھوڑ کر تشریف لے گئے۔

"گھر پہنچے تو مجھے بلایا، میں حاضر ہوا، میں نے دیکھا کہ چہرے پر سخت ناراضی کے اثرات ہیں اور ہاتھ میں کوڑا لیے بیٹھے ہیں۔ میں کانپ گیا اور بہت ڈرا، کیونکہ مجھ سے واقعی ایسا قصور ہوا تھا کہ جس کی سزا مجھے پوری نہ ملی تھی، لیکن انھوں نے مجھ سے فرمایا، "مجھ سے آج جیسی غلطی پہلے کبھی نہ ہوئی، میں نے تمہیں مارا، یہ میری بہت بڑی لغزش تھی، یہ کوڑا لو اور مجھ سے اپنا بدلہ لے لو۔" میں نے عرض کیا، "میرے آقا! خدا کی قسم، میں تو یہ خیال کر کے آیا تھا کہ مجھے میری کوتاہی پر آپ مزید سزا دیں گے اور یہ واقعہ ہے کہ میں اس کا مستحق بھی ہوں، لہٰذا میں آپ سے بدلہ کیا لوں؟ مجھے تو میری غلطی کی سزا ہی نہیں ملی۔"

"زین العابدین نے فرمایا، "کمبخت، بدلہ لے لو!" میں نے عرض کی، "خدا کی پناہ، آپ تو بہت وسعتِ قلبی سے کام لے رہے ہیں۔" غرض زین العابدین بار بار مجھے بدلہ لینے کا حکم فرما رہے تھے اور میں ان کے اس فقرے کو انتہائی حیرانی سے سُن رہا تھا اور ان کی اس تواضع کی عظمت سے زمین سے لگا جا رہا تھا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ میں ان کے ارشاد کی تعمیل نہیں کرتا تو فرمایا، "اچھا اگر تمھیں انکار ہے تو تم آزاد ہو، اور وہ زمین بھی میں تم کو دیتا ہوں۔" یہ ہے میری آزادی اور دولت مندی کی کہانی!"

ایک غلام نے اپنی داستان اس طرح شروع کی، "تم دونوں کے واقعات معمولی نوعیت کے

ہیں: میرا جرم اور کوتاہی اس سے کہیں زیادہ سنگین تھی، میں زین العابدین کا غلام تھا اور تنور پر کھڑا ہوا مہمانوں کے لئے گوشت بھون رہا تھا۔ زین العابدین تشریف لائے اور جلدی کھانا تیار کرنے کو فرمایا میں نے تنور میں سے بھنے ہوئے گوشت کی سلاخیں نکالیں وہ آگ کی طرح بالکل سرخ تھیں میں جلدی سے یہ سلاخیں لیکر چلا۔ اتفاق سے ان میں سے ایک سلاخ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر میرے آقا کے بچہ کے سر پر گری، یہ سلاخ اس کے سر پر اس زور سے لگی کہ اُسکا اس ضرب سے انتقال ہو گیا۔

مہمانوں نے کھانا کھایا اور چلے گئے، زین العابدین نے مجھے پکارا۔ میں دیوانہ وار، ڈرتا، کانپتا، زرد رُو، حاضرِ خدمت ہوا۔ میں اپنے سر پر کفن باندھ کر گیا، انھوں نے میری یہ حالت دیکھی تو دیکھتے ہی معافی کی خوشخبری دی، میں ابھی معذرت کے لئے ایک حرف بھی نہ کہہ پایا تھا کہ فرمایا، تم نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا، تم آزاد ہو۔ پھر فرمایا "بچہ کی تکفین و تدفین کا (۱۰) انتظام کرو۔"

اس کے بعد ایک کنیز نے اپنا ماجرا سنایا، اس نے کہا "میں زین العابدین کی کنیز تھی ایک دن زین العابدین کو وضو کرا رہی تھی۔ ہاتھ میں لوٹا تھا اور پانی ڈال رہی تھی، اچانک میرے ہاتھ سے لوٹا چھوٹ کر گر پڑا۔ پانی کے چھینٹے زین العابدین کے چہرہ پر گرے انھوں نے میری طرف سر اٹھا کر دیکھا اور کچھ نہ فرمایا۔ میں بہت ڈری، مگر معاً سنبھل گئی کیونکہ کہ ان کے عفو و اخلاق کی عادت سے واقف تھی۔ میں نے عرض کی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

" متقی لوگ اپنے غصہ کو قابو میں رکھتے ہیں۔"

زین العابدین:- میں غصہ کو قابو میں رکھونگا۔

کنیز:- اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرماتا ہے کہ "وہ لوگوں کی غلطی کو معاف کرتے ہیں۔"

زین العابدین :۔ "اللہ تعالیٰ تجھے معاف کرے"

کنیز :۔ "اور یہ بھی ارشاد ہے "اللہ محسنوں کو دوست رکھتا ہے"۔

زین العابدین :۔ "جاؤ تم آزاد ہو۔" (۱۱)

مدینے میں خبریں مسلسل پہنچ رہی تھیں کہ یزید بن معاویہ کی تمام زندگی لہو ولعب اور فرائض حکومت سے سہل انگاری میں گزر رہی ہے۔ دوسری طرف لوگوں نے کربلا کے روح فرسا اور جاں گداز ہولناک واقعہ کو بھی فراموش نہ کیا تھا یزید کی حکومت کا یہ تاریک ترین واقعہ تھا جس پر وہ ایک خوشنما اور آراستہ مستقبل کی تعمیر کرنا چاہتا تھا یہی وجہ تھی کہ مدینہ کے عام باشندوں کا طرز و سلوک یزیدی حکومت کے ساتھ موافقانہ نہیں معاندانہ تھا۔ کتاب و سنت کی تاب ناک کرنیں اُن کے اس موقف کی تائید (۱۲) کرتی تھیں۔ لوگوں کے دلوں میں آگ تھی جو یزید کے برخلاف مشتعل تھی۔ چنانچہ یزید کے برخلاف تحریک اٹھی۔ اس کے مقررہ عامل کو اور خاندان بنو امیہ کے لوگوں (۱۳) کو خارج کر دیا گیا۔ بیعت یزید فسخ کر دی گئی۔ یزید نے مدینہ والوں کے ساتھ جنگ کرنے اور ان کو اطاعت پر مجبور کرنے کے لئے مسرف بن عقبہ (۱۴) کو روانہ کیا۔

مسرف بن عقبہ ان ہی دنوں یزید کے پاس فلسطین سے پہنچا تھا۔ وہ ضعیف، بیمار اور بوڑھا آدمی تھا، اس کی ترسٹھ سال (۱۵) عمر ہو چکی تھی۔ یزید نے اس کو اپنے گھر پر طلب کر کے بڑے عذدں کے بعد اس پر آمادہ کیا کہ مختلف اطراف سے عرب و عجم کی مخلوط بارہ ہزار فوج لے کر مدینہ پر چڑھائی کر دے۔ فوجی جھنڈوں پر روح بن زنباع، حُبیش بن دُلجہ، عبداللہ بن مسعدہ، حصین بن نمیر اور زفر بن حارث (۱۶) کو مقرر کیا اور فوجیوں کو بڑے بڑے انعامات سے نوازا۔ چنانچہ اس نے چلنے سے پہلے سو، سو دینار ہر شخص کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

مسرف نے اہل مدینہ سے خونریز جنگ لڑی ۔ یہ لڑائی باب طیبہ (۱۷) کے قریب مدینہ کے بالائی حصوں میں سے ایک مقام حرہ واقم پر ہوئی ۔ دونوں طرف سے زبردست تصادم ہوا ۔ عرصہ تک بغیر کسی ہار جیت کے لڑائی جاری رہی حتیٰ کہ مسرف کامیاب ہو گیا ۔ فتح کے بعد شہریوں کا بیدریغ خون بہایا گیا اور فوجیوں کو تین روز تک آزادانہ لوٹ مار کرنے کی اجازت دے (۱۸) دی گئی ۔

مدینہ کی اس مدافعت میں آزاد شدہ غلاموں نے اپنی جانوں پر کھیل کر لڑائی لڑی ۔ سب سے زیادہ یہی لوگ تیروں کا نشانہ بنے ۔ چنانچہ جنگ ختم ہو جانے کے بعد ان لوگوں کی لاشیں گنی گئیں تو وہ تین یا چار ہزار تھیں ۔ قریش و انصار میں سے تین سو سے زیادہ کام آئے ۔ لوگوں کے اموال لوٹ لئے گئے ، بچوں کو قید کیا گیا اور پردہ نشیں عورتوں کی بے حرمتی کی گئی (۱۹)

مسرف نے لوگوں کو اس شرط پر بیعت لینے پر مجبور کیا کہ وہ یزید کے غلام بن جانے پر راضی ہوں ۔ اس کے بعد وہ چاہے تو ان کو آزاد کر دے اور چاہے تو فروخت کر دے ۔ چنانچہ قریش کے لوگوں کو لایا جاتا تھا اور ان سے کہا جاتا تھا ، اس شرط پر بیعت کرو کہ تم غلام ہو ۔ اگر وہ اس کے جواب میں کہتے ، نہیں ! تو ان کی گردن اڑا دی جاتی ۔ یہ سلسلہ چلا حتیٰ کہ مسرف نے زین العابدین کو بھی طلب کیا ۔ وہ روضۂ نبوی میں پناہ گیر تھے ۔ مسرف کے سامنے پیش ہوئے ۔ ان کے دائیں بائیں مروان اور اس کا لڑکا عبدالملک بھی ہمراہ تھے ۔ جو مسرف سے ان کے لئے امان کی درخواست کر رہے تھے ۔ مسرف کے سامنے جب آپ کو لایا گیا ، تو وہ کہنے لگا : " علی بن حسین کا معاملہ اگر صرف تمہاری امن طلبی تک محدود ہوتا تو خدا کی قسم میں تمہاری بات ہرگز نہ سنتا اور ان کو ضرور قتل کر دیتا ۔ لیکن امیرالمومنین یزید نے مجھے خود ان کے متعلق فرمایا تھا کہ ان کو زندہ رہنے دیا جائے ۔ (۲۰) "

مسرف نے زین العابدین سے کہا "میرے ہاتھ پر بیعت کرو" فرمایا "یزید مجھ سے کس چیز پر بیعت لینا چاہتا ہے؟" زین العابدین کا تخاطب کچھ ایسے انداز میں تھا، کہ مسرف پر ان کی ہیبت طاری ہوگئی، کہنے لگا، "بیعت اس شرط پر کہ آپ ان کے بھائی اور چچا کے صاحبزادے کی حیثیت سے رہیں گے۔" اس کے بعد اس نے زین العابدین کو اپنے برابر جگہ دی اور کہا، "اگر کچھ ضرورت ہو تو فرمایئے" زین العابدین نے صرف ایک درخواست کی، کہ عام پبلک سے تلوار کھینچ لی جائے!

اس کے بعد علی اٹھ آئے اور مسرف بھی واپس چلا گیا۔ علی سے کہا گیا، "آپ جس وقت مسرف کے پاس لیجائے جارہے تھے، ہم نے دیکھا کہ آپ کے ہونٹ پھڑک رہے تھے، آپ کیا فرمارہے تھے؟" جواب دیا، "میں اس کے شر سے اللہ سے پناہ مانگ رہا تھا اور دعا کر رہا تھا کہ خدا اس کو دفع کردے!"

مسرف سے اس کے درباریوں نے پوچھا، "علی جب تک آپ کے پاس نہیں پہنچے تھے۔ آپ ان کو اور ان کے گھر والوں کو گالیاں دے رہے تھے، لیکن جب وہ سامنے آئے تو آپ نے ان کا اکرام کیا" کہا، "میرا دل ان کے رعب جلال سے کچھ اس طرح وہشت زدہ ہوا کہ میں اپنے اختیار میں نہ رہا۔" (۲۱)

اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ مروان اور اس کے لڑکے عبدالملک نے زین العابدین کے لیے امان کی درخواست کی تھی۔ یہ اصل میں اس عنایت و مہربانی کا جواب تھا جو کچھ دن پیشتر زین العابدین نے بنی امیہ پر کی تھی۔ اہلِ مدینہ نے بنی امیہ پر چڑھائی کی، تو مروان نے پہلے پہل ابنِ عمر سے حمایت کی درخواست کی، لیکن انھوں نے انکار کردیا۔ مروان زین العابدین سے

امان کا طالب ہوا۔ زین العابدین نے تمام بنی امیہ کے جان و مال کو امان دی۔ یہ تاریخ کا عجیب موڑ تھا کہ زین العابدین نے اپنے کٹر دشمن کی حمایت کی، اور نہایت امن و آرام سے اُن کو مقام ینبع میں پہنچا دیا۔

مدینہ میں جب اس فتنہ کی گھٹا چھائی تو تمام مدینہ کی عورتوں نے علی کے گھر میں پناہ لی یکے بعد دیگرے عورتوں کی ٹولیاں ان کے مکان کا رُخ کر رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کبوتروں کا ہجوم ہے جو باز سے پناہ لے رہا ہے۔ رات کی خاموشی میں جبکہ تیروں کی بارش بند ہو جاتی تو عورتوں اور بچوں کی فوج گراں اس گھر میں داخل ہوتی۔ ان پناہ گیر عورتوں کی تعداد چار سو کے لگ بھگ تھی۔ ان میں اکثر عبدِ مناف سے تھیں، جو کبھی بھی ان کے گھر میں کنیز کی حیثیت سے نہ رہی تھیں۔ البتہ قلیل تعداد میں ان کے علاوہ بھی کچھ مختلف عورتیں (۲۲) تھیں۔ زین العابدین نے نہ صرف ان کو بے خوف اور محفوظ رکھنے کی کوشش کی بلکہ اُن کی اس حادثہ کے فرو ہونے تک کھانے اور کپڑے سے بھی مدد دی۔ غرض فتنہ فرو ہو جانے پر ہر عورت واپس ہو گئی۔

زین العابدین کی خدمت میں اہلِ مدینہ اپنی مصیبتوں کی فریاد لے کر آتے تو وہ روتے۔ کیونکہ وہ کچھ نہ کر سکتے تھے، البتہ وہ اللہ سے دعائیں مانگ مانگ کر کہہ رہے تھے۔

" اے پروردگار، تو بڑا حلیم ہے، تیری شان اور تیری قدرت بہت عظیم ہے!

" اے پروردگار، اپنی سرزمین پر تو نے اپنے بندوں کو ٹھکانا دیا، وہ یہ یقین رکھتے ہیں، کہ تو ان کو اس سے محروم نہیں کرے گا!

" اے پروردگار، یہ سب کچھ تو دیکھ رہا ہے، تیرے فیصلے اٹل ہیں، تیری تدبیروں کو کوئی رد نہیں کر سکتا، تو ہم سے زیادہ بہتر سمجھتا ہے (۲۳)"

وقت نے بہت تیزی سے کروٹ بدلی، ملک کی خلافت عبدالملک بن مروان کے

ہاتھ میں منتقل ہو چکی تھی۔ عبدالملک نے اہلِ مدینہ سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ وہ موقعہ کی تاک میں تھا کہ کوئی گرفت کا موقعہ ہاتھ آئے، گو وہ سب سے زیادہ زین العابدین سے ڈرتا تھا مگر فرصت و موقعہ کی تاک میں رہتا کہ کسی طرح اُن ہی سے اپنے شر کی ابتدا کرے۔

عبدالملک کو معلوم ہوا کہ زین العابدین نے اپنی کنیز کا کسی سے نکاح کر دیا ہے، جس نے اُن کو پرورش کیا تھا اور جس کو عرصہ تک وہ اپنی ماں تصور کرتے رہے تھے۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ خود زین العابدین نے ایک باندی جو اُن کے تائے حضرت حسن کے ترکہ میں ان کو ملی تھی۔ اس کو آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا ہے۔ عبدالملک نے اپنے اعتراض کی گرفت میں لینے کے لئے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور زین العابدین کو لکھا،

" معلوم ہوا ہے کہ تم نے اپنی باندی سے نکاح کیا ہے کیا تمہارے خاندان (قریش) میں کوئی لڑکی اس قابل نہ تھی، جس کو تم اپنے نکاح میں لاتے اور ہونے والی اولاد کو بھی خاندانی عزت بخشتے، تم نے نہ خود پر نظر کی، اور نہ ہونے والی اولاد کو کہیں کا چھوڑا۔"

علی بن حسین نے خط پڑھ کر عبدالملک کو جواب میں لکھا۔

" حمد و صلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ تمہارا خط ملا، تم نے مجھے اپنی باندی سے نکاح کر لینے پر بُرا بھلا کہا ہے، تمہارا خیال ہے کہ مجھے شادی کے لیے قریش میں سے کوئی لڑکی انتخاب کرنی چاہیئے تھی تاکہ پیدا ہونے والی اولاد کو خاندانی عزت نصیب ہوتی، یاد رکھو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر عزت و شرف میں کوئی شخص نہیں ہو سکتا، باندی میری ملک تھی، جس کو میں نے خدا کی خوشنودی و ثواب حاصل کرنے کے لئے اپنی ملک سے آزاد کیا، اور اُسی کے حکم کے مطابق میں نے اس سے نکاح کیا۔ خدا کے دین میں انسان کے شرف کے لیے یہ باتیں قطعاً خلل انداز نہیں۔ اللہ نے خاندانی پستی کو ختم کرتے ہوئے

تنقیص و ملامت کی تمام شکلوں کو غلط قرار دیا ہے۔ لہذا کسی مسلمان کو ملامت نہیں کرنی چاہیئے، ملامت کے قابل جاہلیت کے پرانے دستور ہیں، والسلام۔"

عبدالملک نے یہ خط پڑھا، پڑھ کر اپنے لڑکے سلیمان کی طرف پھینک دیا۔ سلیمان نے پڑھ کر کہا، "امیرالمومنین، علی بن حسین نے آپ کے مقابلہ میں جو فخر کا اظہار کیا ہے، اس کا بڑا ہی ناگوار انداز ہے!"

عبدالملک نے کہا، "بیٹا یہ نہ کہو، علی بن حسین، بنی ہاشم کے خاندان میں بڑے زبان آور ہیں، لوگ جس مقام پر ذلیل ہوتے ہیں، علی بن حسین اسی مقام پر سربلند ہوتے ہیں۔"

پھر عبدالملک نے درباریوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا، "مجھے کوئی ایسا شخص بتاؤ کہ وہ اس سطح پر ہونے کے باوجود، کہ جس پر معمولی انسان ہوتے ہیں پھر بھی لوگوں میں شرف و عزت کے اعتبار سے ترقی کر رہا ہو؟"

درباریوں نے عرض کیا، "حضور وہ تو آپ ہی ہیں۔"

عبدالملک نے کہا، "ہرگز نہیں!"

درباریوں نے عرض کیا، "امیرالمومنین کے سوا ہمیں ایسا کوئی نظر نہیں آتا۔"

عبدالملک نے کہا، "ہرگز نہیں، امیرالمومنین نہیں، بلکہ وہ علی بن حسین (۴) ہیں۔"

---

(۱) العقد الفرید، جلد ۵، صفحہ ۴۔

(۲) الوحی المحمدی، صفحہ ۲۹۵۔

(۳) اعیان الشیعہ، جلد ۴، صفحہ ۴۶۴

(۴) تاریخ الیعقوبی جلد ۳، صفحہ ۶

(۵) اعیان الشیعہ، جلد۴، صفحہ ۴۵۳

(۶) الصفوۃ، جلد۲، صفحہ ۵۳

(۷) الصفوۃ، جلد۲، صفحہ ۵۶ ۔ دائرۃ المعارف للبستانی، جلد۹، صفحہ ۳۵۷

(۸) اعیان الشیعہ، جلد۴

(۹) اعیان الشیعہ، جلد۴، صفحہ ۴۷۴، صفحہ ۴۴۶

(۱۰) " " " ۴۴۵

(۱۱) " " " "

(۱۲) صُوَر من التاریخ الاسلامی، صفحہ ۱۵۷

(۱۳) مختصر تاریخ العرب، صفحہ ۷۵ و مروج الذہب، جلد۳، صفحہ ۱۶

(۱۴) اصل نام مسلم بن عقبہ تھا، لیکن ملت کے ساتھ غداری کے نتیجہ میں عام لوگ اُسے مسرف یا مجرم کہتے تھے۔ مروج الذہب، جلد۳، صفحہ ۱۷

(۱۵) طبری، جلد۴، صفحہ ۳۷۱ و العقد الفرید، جلد۴، صفحہ ۳۸۷

(۱۶) تاریخ الیعقوبی، جلد۲، صفحہ ۲۲۳

(۱۷) تاریخ الخلفاء، صفحہ ۱۳۹

(۱۸) واقعہ حرہ میں مقتولین کی تعداد پر مورخین کا بیان انتہائی مختلف ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ اپنی نوعیت کا اس قدر فتنہ ساماں تھا کہ کسی کو بھی مقتولین کے شمار کا ہوش نہ تھا۔

(۱۹) معجم البلدان، جلد۳، صفحہ ۲۶۲

(۲۰) طبری، جلد۴، صفحہ ۳۷۹

(۲۱) مروج الذہب، جلد۳، صفحہ ۱۸

(۲۲) اعیان الشیعہ، جلد۴، صفحہ ۱۶۱

(۲۳) الصحیفۃ الخامسۃ، صفحہ ۲۸۵

(۲۴) اعیان الشیعہ، جلد۴، صفحہ ۲۸۰

بھولی بسری یادیں

امیر معاویہؓ نے مدینہ کی امارت سے زید بن ثابتؓ کو معزول کرتے ہوئے عبدالملک بن مروان کو مقرر کیا۔ عبدالملک کی عمر اس وقت صرف سولہ سال (۱) تھی۔ اس زمانہ میں عبدالملک کی مسجدِ نبوی میں آمد و رفت بکثرت تھی۔ گو وہ نو عمر لڑکا تھا، لیکن مسجدِ نبوی میں حاضری کا بڑا شائق تھا۔ وہ صحابہ و تابعین کی علمی مجلسوں میں بیٹھ کر مستفید ہوتا۔ واقعہ حرّہ کے موقعہ پر جب مسرف بن عقبہ نے اپنے لشکر سمیت مدینہ پر دھاوا بولا، تو اس کی فوج میں سے ایک شخص "یحییٰ غسانی" عبدالملک کے پاس مسجدِ نبوی میں حاضر ہوا۔ عبدالملک نے اس کو دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے قاتلانہ وحشت و خون برس رہا ہے۔ اس سے پوچھا، "تم اسی فوج سے تعلق رکھتے ہو؟" جواب دیا، "جی ہاں"۔ عبدالملک کہنے لگا، "خدا غارت کرے آخر تم لوگ کس پر حملہ آور ہوا چاہتے ہو؟"

عبدالملک خلافت کا متمنی تھا، وہ ایک ایسی خلافت کا علم بردار بننا چاہتا تھا جس میں عام رعایا سے عدل و انصاف کا سلوک اور دوستوں سے مروّت و پاسداری برتی جائے۔ چنانچہ کسی موقعہ پر خانہ کعبہ کے سایہ میں بیٹھے ہوئے اس نے "عمارۃ الفقیہ" سے کہا تھا، "عمارہ! اگر تم زندہ رہے تو دیکھو گے کہ لوگوں کی گردنیں میرے سامنے جھکی ہوئی ہوں گی۔ اور ان کی آرزوں کی تکمیل (۲) ہو رہی ہو گی۔" لیکن خلافت اس کے ہاتھ آئی تو اس کے الفاظ

کا تار و پود بکھر کر رہ گیا۔ اس میں یکسر تبدیلی ہو گئی۔ اہلِ مدینہ پر سنگ دلی کا وہی مظاہرہ کیا گیا جو
اس کے پیش رؤں نے روا رکھا تھا۔ جنگ آزمائی اور لوگوں کو کچل ڈالنے کے لئے اس نے
بھی لشکر حجاز کی طرف روانہ کئے۔ اس لشکر میں وہی یحییٰ غسانی "اسی عبدالملک کے حکم
سے حجازیوں کے خلاف جنگ کرنے اور ان کو زبردستی تابع فرمان بنانے کے لیے چڑھائی
کر رہا تھا۔ وہ عبدالملک پر نوحہ پڑھ رہا تھا اور حیرانی میں ڈوبا (۳) ہوا تھا۔

عبدالملک نے ۷۵ھ میں حج (۴) کیا۔ پہلے مسجد نبوی میں حاضر ہوا۔ نہایت
گرجدار، فتنہ انگیز اور ناقابلِ برداشت تقریر کی، اور حج کے لئے روانہ ہو گیا۔ طواف میں
مشغول تھا، کہ زین العابدین کو بھی طواف کرتے ہوئے دیکھا۔ ارادتاً خود کو نمایاں کرتے
ہوئے ان کے سامنے سے گزرا، تاکہ وہ دیکھیں، لیکن زین العابدین نے اس کی طرف کوئی
التفات نہیں کیا۔ وہ تلبیہ پڑھتے ہوئے پورے خشوع و خضوع کے ساتھ طواف کرنے
میں مشغول رہے۔ اس طور طریق کا عبدالملک پر بڑا اثر ہوا۔ عبدالملک کا خیال تھا کہ زین العابدین طواف
سے فارغ ہو کر اُسکی خدمت میں آکر ملیں گے۔ لیکن زین العابدین تشریف نہ لائے۔ تو
اس نے حکم دیا کہ زین العابدین کو ہماری خدمت میں حاضر کرو۔ وہ تشریف لائے تو
کہنے لگا، "تمہارے والد کو میں نے قتل نہیں کیا، کیا وجہ ہے کہ تم مجھ سے نہیں ملتے؟"

زین العابدین نے فرمایا، "تیرے باپ کے قاتل نے ہماری دنیا برباد کی، اور میرے باپ
نے اپنی مظلومانہ شہادت سے اس کی آخرت کو تباہ کیا۔ اگر تم بھی یہی پسند کرتے
ہو تو شوق سے کر گزرو۔"

عبدالملک کہنے لگا، "نہیں، نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم کو ہم سے وابستہ
رہنا چاہیے۔ تمہیں کوئی ضرورت ہو تو اظہار کرو۔ ہم پوری کر دیں گے۔"

فرمایا "بیت اللہ میں اللہ کے سوا کسی سے سوال نہیں کیا جا سکتا!"
عبدالملک اس خود داری کے جواب پر غصہ سے پیچ و تاب کھانے لگا، لیکن زین العابدین نے کوئی پروانہ کی، خانہ کعبہ کے پردوں سے چمٹ چمٹ کر دعا مانگنے لگے، "یا الٰہی! دنیوی بادشاہوں نے اپنے دروازے بند کر کے ان پر چوبدار اور محافظ مقرر کر دیئے۔ لیکن تیرا دروازہ تمام سائلین کے لئے کھلا ہے۔ میں بھی حاضر ہوا ہوں تاکہ تیری نظرِ التفات حاصل (۵) کروں۔"

عبدالملک نے ابان بن عثمان بن عفان کو مدینہ سے معزول کرتے ہوئے ان کی جگہ ہشام بن اسمٰعیل مخزومی (۶) کو مقرر کیا۔ وجہ یہ تھی کہ ابان ہزل و تمسخر کے عادی اور مذاقی آدمی تھے (۷) ان کے مقابلہ میں ہشام مخزومی خشک اخلاق اور درشت مزاج تھا۔ ہشام نے مدینہ پہنچ کر اہل مدینہ اور وہاں کے فقہا و گوشہ نشین عبادت گزاروں کو سخت اذیتیں دیں۔ خصوصاً زین العابدین اور اُن کے اہلِ بیت کو مسجدِ نبوی میں برملا اپنی دشنام طرازیوں اور گوناگوں ایذا رسانیوں کا نشانہ بنایا۔ زین العابدین اس ناروا سلوک کے جواب میں قطعاً خاموش تھے۔ اہل بیت میں سے اگر کوئی ہشام کو اس بدتمیزی سے منع کرنا چاہتا تو زین العابدین اس کو منع کر دیتے۔ فرماتے،
"مخزومی کو جو کچھ وہ چاہتا ہے کر لینے دو۔ اس کی معزولی یا تباہی کے دن قریب ہی ہیں (۸)۔"

زین العابدین کی اس تشویش کو دور کرنے اور دل کو صبر و قرار بخشنے والی صرف نماز یا دعا تھی۔ اس سے بھی زیادہ ان کے قلب کو صبر و ثبات ہر سال حج میں نصیب ہوتا۔

ایک عمدہ اور تیار اونٹنی پر حج کو روانہ ہوتے۔ اس کو اپنی رفتار میں آزاد چھوڑ دیتے اور وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ دوڑتی رہتی۔ نرم مزاجی کا یہ عالم تھا کہ اس کو مشقت میں ڈالنا اور جھڑکنا تک بھی گوارا نہ تھا۔ اگر اس کی چال میں تھکان یا گھبراہٹ محسوس کرتے تو کوڑا اس کی نگاہوں سے چھپا دیتے اور یہ حالت دور ہونے تک نیچے اتر کر پیادہ سفر کرتے۔ احرام باندھ کر مواقع حج میں داخل ہو جانے کے بعد زین العابدین پر خوف الٰہی کے آثار نمایاں ہونے لگتے، چہرے کا رنگ زرد پڑ جاتا۔ آواز میں تضرع اور خشیت ہوتی۔ مسجد الحرام میں پہنچنے کے بعد میزاب رحمت کے نیچے کھڑے ہو جاتے۔ حرم کی جانب متوجہ ہو کر رو رو کر دعائیں مانگنے لگتے۔ دیکھنے والوں کے بھی دل بھر آتے اور ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔

ایک مرتبہ ایسی ہی حالت میں ان کو مشہور محدث و عابد طاؤس نے دیکھا زین العابدین جس وقت اپنی دعا اور گریہ وزاری سے فارغ ہوئے تو طاؤس نے آگے بڑھ کر عرض کی۔

"اے صاحبزادۂ رسول! میں نے تمہیں ایسی حالت میں دیکھا کہ میں تم میں تین وصف قابل رشک پاتا ہوں۔ امید ہے کہ ان کی بدولت آپ کو آخرت میں کوئی خطرہ نہیں پیش آئے گا!"

زین العابدین :۔ وہ وصف کیا ہیں، طاؤس؟

طاؤس :۔ ایک یہ کہ آپ رسول اللہ کی اولاد میں سے ہیں۔ دوسرے اپنے بزرگوار رسول اکرم کی شفاعت آپ کو حاصل ہوگی، تیسرے خدا کی رحمت آپ کے ساتھ ہوگی۔

زین العابدین :۔ طاؤس! رسول اللہ کی اولاد میں سے ہونا اخروی اطمینان کیلئے کافی نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، "قیامت کے دن باہمی نسب ختم ہو جائیں گے" شفاعت

رسولؐ کے متعلق بھی اس کا یہ اعلان ہے کہ انبیاء صرف اس شخص کی شفاعت کریں گے جن کو اللہ پسند کرے گا۔ رحمتِ الٰہی کا معاملہ فرمانِ الٰہی کے مطابق یہ ہے کہ اس کی رحمت صرف نیک کاروں سے (۹) قریب ہوگی۔"

یہ فی البدیہہ جواب سنکر طاؤس ہکا بکا رہ گئے اور اپنے نظریہ میں نئی معلومات کا اضافہ کر کے وہاں سے رخصت ہوئے۔

حج کرنیوالوں میں بصرہ کے عابدوں کی ایک جماعت بھی تھی۔ مکہ میں امسال پانی کا قحط تھا۔ ہر چہار طرف پیاس بجھانے کے لیے پانی پانی کی صدائیں بلند تھیں کیونکہ بارش نہیں ہوئی تھی لوگ ایک دوسرے سے پانی مانگتے تھے۔ مگر پانی کہاں حتیٰ کہ مکہ کے باشندے پانی کی تلاش میں سرگرداں تھے، لوگوں نے بصرہ کے عابدوں سے درخواست کی کہ وہ اللہ سے بارش کی دعا مانگیں۔ چنانچہ وہ حضرات جمع ہوئے۔ کعبہ کا طواف کیا۔ پھر نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعائیں مانگنے لگے۔ وقت گزرتا رہا مگر آسمان پر بادل کا چھوٹا سا ٹکڑا بھی نظر نہ آیا۔ لہٰذا لوگ تمام رات بے چین رہے اور پیاس دور کرنے کے لیے پانی کی تلاش میں سرگرداں رہے دم بدم لوگوں کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ اچانک ان کی نظر ایک خاموش نوجوان پر پڑی جو زرد رو تھا، خوفِ الٰہی کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں تھے، گندم کی بالوں کی طرح متحرک جسم کے ساتھ طواف میں مشغول ہوگیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اندرونی بے چینی اور غم و آلام نے اس کو مضطرب کر رکھا ہے۔ لوگ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ تعاقب کرتی ہوئی مسلسل نظریں اس پر جم گئیں۔ وہ جب اپنے طواف سے فارغ ہوا تو لوگوں کے ہجوم نے اس کو گھیر لیا ہر شخص کی درخواست تھی، "اے نوجوان ہمیں پیاس نے مار ڈالا ہے، ہمارے لئے بارش

کی دعا کریں"

نوجوان نے بصرہ کے عابدوں پر نظر ڈال کر پہچانتے ہوئے کہا، "تم نے کیوں بارش کی دعا نہیں مانگی؟" کہنے لگے، "ہم نے بہت دعائیں مانگ لیں، قبول کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔"

نوجوان نے سب عابدوں کو یکے بعد دیگرے نام لے لے کر پکارا۔ "اے مالک، اے ثابت! اے ایوب!....." پھر ان سے فرمایا، "تم لوگ کعبہ سے باہر نکل جاؤ، اگر تم میں ایک بھی مردِ راہ ہوتا تو تم لوگوں کی دعا ضرور قبول ہوتی۔" چنانچہ یہ عابد و زاہد لوگ اس جگہ سے ہٹ گئے۔ نوجوان نے ترساں و لرزاں کعبہ کا طواف کیا۔ حزن و غم اس کی پیشانی سے نمایاں تھا، وہ کعبہ کی طرف بڑھا، نماز پڑھی اور سجدہ میں گر کر دعا مانگنے لگا۔ ابھی اس نے دعا پوری نہ کی تھی کہ آسمان پر ابر چھا گیا، اور دیکھتے دیکھتے زور کی بارش برسنے لگی۔ نوجوان نے سجدہ سے سر اٹھایا۔ واپس ہوتے وقت اس کی زبان پر یہ شعر تھے ؎

من عرف الرب فلم تغنہ	"جو شخص خدا شناس ہو، لیکن اس کو اس سے
معرفۃ الرب فذاك الشقی	کوئی فائدہ نہ ہو تو وہ یقیناً بد نصیب ہے۔"
ما ضر ذا الطاعۃ ما نالہٗ	"عبادت گزار کو عبادت میں جو کچھ ملتا ہے
فی طاعۃ اللہ وماذا لقی	وہ خسارہ کا سبب نہیں ہوتا۔"
ما یصنع العبد بغیر التقی	"بندہ کسی کام کا نہیں ہوتا بغیر پرہیزگاری کے،
والعز کل العز للمتقی	کامل عزت صرف متقی کے ہی ہاتھ آتی ہے۔"

لوگوں نے نوجوان سے متعارف ہونے کے لئے مکہ والوں سے پوچھا، "یہ کون نوجوان ہے؟"

مکہ والوں نے جواب دیا،

"تم ان کو نہیں پہچانتے؟ یہ زین العابدین علی بن حسین (۱۰) ہیں۔"

باپ کی حیات میں ہشام بن عبدالملک ولی عہد نے حج کا ارادہ (۱۱) کیا۔ حشم وخدم اور محافظوں کا اتنا ہجوم ہمراہ ہوا کہ سورج کی کرنیں زمین تک نہ پہنچ سکیں۔ لوگوں کے دل رعب ہیبت سے دہل گئے۔ ہشام شاہی محافظوں کے جلو میں وارد ہوا چاہتا تھا۔ والی مدینہ ہشام بن اسمٰعیل اپنے ٹھاٹ باٹ کے ساتھ استقبال کے لئے موجود تھا۔ غرض بیت الحرام تک ولی عہد کے پہنچتے پہنچتے شاہی رعب جلال میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ اگر یہ تمام لوگ احرام کے کپڑے پہنے نہ ہوتے تو ہشام اور اس کے ہمراہیوں کے شاہی لباس کی وجہ سے غالباً دیکھنے والوں کا یہ تخیل ہوتا کہ کوئی بہت بھاری فوج حرم میں داخل ہوا چاہتی ہے۔

ولی عہد اور تمام غلام پیشہ، طواف کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ ہشام کی احرام پوش فوج نے آگے بڑھ کر شاہزادے کے لئے راستہ وسیع کرنا چاہا لیکن یہ خدا کا گھر تھا اور صرف خانۂ خدا کی عظمت سے لوگوں کے دل معمور تھے۔ کسی نے شاہی محافظوں کی طرف التفات نہ کیا، لوگوں نے یہ جاننے کے باوجود کہ ان کے پیچھے شہزادہ آرہا ہے نہ کوئی توجہ کی اور نہ راستہ چھوڑا۔ فوج نے بہت زور لگایا لیکن ہجوم کے سامنے کوئی پیش نہ چلی۔ ہشام کی آرزو تھی کہ حجر اسود تک پہنچے، لیکن یہ مسئلہ انتہائی دشوار ہو گیا۔ سر اٹھا اٹھا کر دور سے حجر اسود کو دیکھنا چاہا لیکن نہ دیکھ سکا، کیونکہ لوگوں کا ہجوم اس طرح حائل ہو گیا تھا جیسے کوئی پہاڑ حائل ہو گیا ہو۔

ہشام کے جلال وعظمت کو سخت ٹھیس پہنچی، ہر شخص ہشام کو دیکھتا اور بے رخی کے ساتھ آگے بڑھ جاتا۔ کچھ لوگ بغور اسے دیکھ کر دل ہی دل میں ہنس رہے تھے کیونکہ ہشام انتہائی بھینگا بھی تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی وقار نہ تھا۔ جو کوئی دیکھتا، اس

کی نظروں میں خفیف ہو جاتا حتیٰ کہ اس کے اہل شہر حمص والے بھی اسکو دیکھ کر ہنس دیتے، ان کی نگاہوں میں ہشام اور حمص کے ایک نعل بند "عروان" میں ایسی گہری مشابہت و یکسانیت موجود تھی، گویا چہرہ مہرہ میں عروان اور ہشام دونوں ایک ہی قالب میں ڈھلے ہوئے (۱۲) تھے۔

کچھ دیر بعد حجر اسود کے قریب کھڑے ہونے والوں نے دور سے گرج دار تکبیر کی آواز سنی۔ یہ آواز آہستہ آہستہ ان کے قریب آتی جا رہی تھی۔ تکبیر کی یہ مسلسل آوازیں ایک ضعیف الجثہ اور نازک بدن انسان کو آگے لا رہی تھی، آواز برابر قریب ہوتی گئی۔ لوگوں کی تکبیر و تہلیل کی وجہ سے فضا میں ایک ہیبت ارتعاش پیدا ہوا۔ گویا روئے زمین کا ہر متکلم اور خاموش انسان اس وقت تکبیر و تہلیل اور تلبیہ میں مشغول تھا۔ اب وہ بزرگ ہستی حجر اسود سے قریب ہو چکی تھی جس کے گرد تکبیروں کی آواز گونج رہی تھی۔ لوگوں نے دیکھا ایک دھان پان آدمی، چھریرا بدن، زرد رو، لرزاں ترساں، لیکن پر نور چہرے اور ہیبت و جلال کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ لوگوں نے اس کی مثیل و نظیر نہ دیکھی ہوگی۔ چہرہ آئینہ کی طرح شفاف، کہ جس میں قبیلہ کی دوشیزائیں اپنے چہروں کا عکس (۱۳) دیکھیں۔ احرام کی چادر اور تہ بند میں ملبوس سر جھکائے اور نگاہیں نیچی کئے آگے بڑھا۔ . . . .

. . . . . . پیشانی پر سجدوں کا گہرا نشان قائم (۱۴) تھا۔ لوگوں کی صفوں میں انتشار ہوا۔ لوگ اس ہستی کو چلنے کے لئے کشادہ راستہ دے رہے تھے، تاکہ وہ حجر اسود کو بوسہ دے سکے۔

تکبیر کی آوازیں ہر طرف بلند تھیں، لوگوں کی نظریں اس بزرگ ہستی کو دیکھنے کے لئے ہر طرف بے قرار تھیں گویا اس کی زیارت ان کی آنکھوں کے لئے سکون بخش سرمہ تھا، جو دیکھ لیتا، اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر گئے، جو نہ دیکھ پاتا وہ اپنی

محرومیٔ قسمت پر آنسو بہاتا۔ یہ نوزاب حجرِ اسود کے قریب پہنچ چکا تھا، اور اطمینان سے اس کو بوسہ (۱۵) دے رہا تھا۔

ہشام کے لیے یہ صورتِ حال بڑی پریشان کُن تھی۔ اس کے وقار کا سوال تھا، اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ پہاڑ اور چھوٹی سی چڑیا کا تقابل ہے۔ خود اس کے ہمراہی اور شاہی محافظ اس نوارد کی طرف متوجہ ہو کر اس منظر سے لطف لے رہے تھے۔ وہ اس آنے والے کو راستہ بھی دے رہے تھے اور تکبیر بھی کہہ رہے تھے۔

ہشام نے طواف کی جگہ سے پیچھے ہٹ جانا مناسب سمجھا، تاکہ لوگوں کا ہجوم اس سے مزاحم نہ ہو۔ وہ کچھ دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ زمزم کی جانب حطیم میں اپنے لیے منبر بچھوایا، اور لوگوں کے ہجوم کے کم ہونے تک اس پر بیٹھا (۱۶) رہا۔ وہ جوشِ غضب اور ناگواری سے پیچ و تاب کھا رہا تھا ہجوم قدرے کم ہوا اور لوگوں میں اطمینان کی کیفیت ہوئی تو ہشام کے خاص مصاحبوں اور محافظوں میں سے کسی نے آکر ہشام سے پوچھا، "یہ کون شخص ہے جس کا لوگ اس قدر اعزاز و اکرام کر (۱۷) رہے ہیں۔"

ہشام نے جواب دیا، "میں نہیں جانتا۔"

ہشام اپنے اس جواب میں جھوٹا تھا، وہ اس کو خوب جانتا تھا۔ لیکن اس کو اندیشہ یہ تھا کہ کہیں ان لوگوں کے دلوں میں بھی اس کی عظمت کا سکہ نہ بیٹھ جائے۔ اور لوگ اس گرویدگی کے نتیجہ میں کہیں اس کو اپنا بادشاہ تسلیم نہ (۱۸) کرلیں، ہشام اس سفرِ حج میں یہ خیال کر کے نکلا تھا کہ اگر زین العابدین کا اور اس کا کسی موقعہ پر

سامنا ہوا تو وہ علی بن حسین پر غلط انداز نگاہیں ڈالتا ہوا اور اپنے مصاحبوں اور محافظ فوج کے دل میں علی بن حسین اور بنی ہاشم کی قدر و منزلت کو پست کرتا ہوا آگے بڑھ جائے گا، مگر ایسا نہ ہو سکا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس محافظ سپاہی کا سوال بھی تجاہل پر مبنی تھا۔ وہ ہشام کو ٹٹولنا چاہتا تھا اور اس کا جواب سن کر دل لگی کرنا چاہتا تھا۔ علی بن حسین کی شخصیت ایسی نہ تھی کہ کسی شخص کو تعارف حاصل کرنے کے لیے ان کے متعلق دوسروں سے پوچھنا پڑے، وہ ہر سال اسی طرح احرار اور آزاد شدہ غلاموں کے جھرمٹ میں دعا و تلبیہ کرتے تشریف لایا کرتے تھے تکبیر و تہلیل کرنے والوں کا ایک ہجوم گرجتے اور برستے بادلوں کی طرح ان کے ہمراہ ہوتا تھا۔

ناواقفیت کے انداز میں ہشام کا جو جواب تھا وہ وہیں ختم نہیں ہو گیا۔ بات چل پڑی اور تقریباً سب ہی کو معلوم ہو گئی، قبائل کے سرداروں کی ایک جماعت جو مطاف سے علیحدہ دور کھڑی ہوئی تھی، ہشام کے اس تجاہل عارفانہ کی تہہ کو پہنچ گئی۔ ان کے دلوں میں اہل بیت کے خاندان کی عظمت تھی۔ اتفاق یہ تھا کہ ان میں اس وقت ہمام بن غالب ابو فراس فرزدق شاعر بھی موجود تھا، وہ ستر سال کی (۱۹) عمر میں تھا، لیکن اہل بیت کی محبت اس کے دل سے کم نہ ہوئی تھی۔ جب اُسے زین العابدین کی شخصیت کے بارے میں ہشام کے انکار کرنے کا حال معلوم ہوا تو غصہ سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کے گرد جمع ہونے والے ہمراہیوں نے کہا، ابو فراس کیا بات ہے؟ کہنے لگا، تم نے بھینگے کی بات نہیں سنی؟ لوگوں نے موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، کہ اچھا ہے فرزدق جوش میں آجائے جواب دیا: "ابو فراس پھر تم ہی اس کو معاف کر دو۔" فرزدق کی تیوری کے بل دیکھنے کے قابل تھے۔ وہ سمندر کی طرح جوش میں آگیا اور یہ بھی بھول گیا کہ ابھی طواف کے کچھ چکر پورے کرنے ہیں اس نے شعر کہے

هٰذَا الَّذِیْ تَعْرِفُ الْبَطْحَاءُ وَطْأَتَهٗ
وَالْبَیْتُ یَعْرِفُهٗ وَالْحِلُّ وَالْحَرَمُ

"یہ وہ ہستی ہے جس کے قدموں سے بطحاء کی سرزمین روشناس ہے۔ بیت اللہ بھی اس سے واقف ہے اور حِل و حرم بھی"

آواز آئی ابوفراس، مکرر، ذرا اونچی آواز میں۔ فرزدق نے آواز اٹھائی اور کہا ؎

هٰذا ابن خیر عباد اللہ کلهم
هٰذا التقی النقی الطاهر العلم

"یہ تمام بندگانِ خدا میں اشرف ترین ہستی کی اولاد ہے، متقی، پاکیزہ دل، عیوب سے پاک اور علوم کا جامع ہے۔

یکاد یمسکه عرفان راحته
رکن الحطیم اذا ما جاء یستلم

وہ جس وقت رکنِ حطیم کا استلام کرنے کے لئے آگے بڑھتا ہے تو حطیم اس کی خوشبو سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔

اذا رأته قریش قال قائلها
الیٰ مکارم هٰذا ینتهی الکرم

"قریش کے لوگ جب اسے دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اسکے حسنِ اخلاق پر مکارمِ اخلاق ختم ہیں"

طواف کرنے والوں نے سنا کہ کوئی شاعر نہایت شیریں اور دلچسپ شعر پڑھ رہا ہے۔ اخلاص و جذبات سے فی البدیہہ شعر اس طرح سنا رہا ہے گویا وہ اسے پہلے سے یاد ہیں اور اشعار کا مضمون اس کا عقیدہ ہے۔ چہار طرف سے لوگ سمٹ آئے، آوازیں آنے لگیں۔ شاعر! ذرا اونچی آواز میں پڑھو، ہم بھی سنیں، بعض نے پوچھا یہ کون ہے؟ بتایا گیا کہ فرزدق ہے، لوگ فرزدق کا نام سن کر کلام سننے کو بے تاب ہو گئے۔ انھوں نے شاعرِ عرب کی زبان سے سید العرب و العجم کی شان میں اشعار سننے کو اپنی خوش بختی تصور کیا۔ کہنے لگے، ابوفراس، تمھیں خدا کی قسم دیتے ہیں اپنی آواز اونچی کرو! فرزدق نے آواز اٹھائی۔ اس کے ہاتھ کے اشارے گویا لوگوں پر اشعار کی بارش کر رہے تھے اور اس کی آواز صحنِ حرم کے در و بام سے ٹکراتا ہوا شیریں نغمہ تھا۔ اس

نے کہا ؎

هٰذا ابن فاطمة ان کنت تجهله
بجدّه انبیاء الله قد ختموا

اگر تو نہیں جانتا تو میں بتلاتا ہوں، یہ فاطمہ کا بیٹا ہے، اسکے نانا پر خدا کے پیغمبروں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے

یغضی حیاءً و یُغضیٰ من مهابته
فما یکلّمُ الاحین یبتسمُ

اس کی نگاہیں حیا سے نیچی رہتی ہیں اور لوگوں کی نگاہیں اس کی ہیبت سے، اس کی خندہ روئی کے علاوہ دیگر اوقات میں کسی کو اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

ینشق نور الهدیٰ عن صبح غرته
کالشمس تنجاب عن اشراقها الظلم

"اس کی روشن پیشانی سے ہدایت کی کرنیں اس طرح پھوٹتی ہیں جس طرح سورج کی روشنی سے تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔"

ہر طرف سے آفرین و مرحبا کے ڈونگرے برسنے لگے، فرزدق رواں دواں اپنا قصیدہ گو گا رہا تھا، حرم کا صحن بازار کا میلہ معلوم ہونے لگا۔ لوگ طواف کو بھی بھول گئے۔

رات کا پچھلا پہر تھا کہ فرزدق کے پاس زین العابدین کے آدمی نے پہنچ کر کہا:

"علی بن حسین کے متعلق تم نے جو اشعار کہے ان کا واقعہ علی بن حسین کو معلوم ہوا، یہ ایک ہزار دینار انھوں نے تم کو بھیجے ہیں، فرزدق نے عطیہ واپس کرتے ہوئے کہلایا، "میرا قصیدہ خدا کی خوشنودی کی خاطر تھا۔ آپ سے عطیہ و انعام پانے کے لئے (۲۰) نہ تھا۔"

قاصد دوبارہ واپس آیا، کہ علی بن حسین یہ رقم واپس لینے کو تیار نہیں، فرماتے ہیں، "ہم اہل بیت کوئی چیز دے کر واپس نہیں لیتے۔" اس کے بعد فرزدق نے مجبور ہو کر عطیہ رکھ لیا۔

حج کا موسم ختم ہوا۔ فرزدق مدینہ کے قصد سے روانہ ہو گیا، عسفان کا چشمہ جہاں سرسبز چراگاہ اور کھجور کے باغات تھے اور جو مکہ و مدینہ کے درمیان مکہ سے دو منزل کے (۲۱) فاصلہ پر تھا۔ فرزدق نے وہاں پہنچ کر دیکھا، شاہی فوج راہ میں حائل ہے۔ گزرنے والوں کی تفتیش اور پڑتال ہو رہی ہے۔ لوگوں کو پہچاننے کے بعد گزرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ فرزدق گزرنے لگا تو اس کو پہچانتے ہوئے ہشام بن عبدالملک کی ہدایت کے مطابق گرفتار (۲۲) کر لیا گیا اور وہیں ایک قید خانہ میں بند کر دیا گیا۔ فرزدق اس ناروا سلوک پر بھڑک اٹھا اور ہشام کی ہجو میں کہا ؎

ایحبسنی بین المدینۃ والتی — "کیا مجھے مدینہ اور اُس پاک سرزمین حرم کے درمیان
الیھا قلوب الناس یھوی منیبھا — قید کیا جا رہا ہے جس کی طرف عشقِ الٰہی میں ڈوبے ہوئے دل متوجہ ہوتے ہیں:

یقلب رأسا لم یکن رأس سید — ہشام کا سر ایک سردار کا سر نہیں، اس کی بھینگی
وعینا لہ حولاء باد عیوبھا — آنکھوں میں کس قدر کھلا عیب ہے۔"

ہشام بن عبدالملک دمشق واپس ہوا اور باپ سے تمام واقعات دہرائے، ہشام کے مصاحبوں نے بھی جو کچھ دیکھا اور سنا تھا، گوش گزار کیا۔ ان لوگوں نے زین العابدین کی عظمت و جلال ایسے آراستہ الفاظ میں بیان کی کہ عبدالملک کو اُن کی طرف سے خطرہ ہوا کہ زین العابدین کہیں خلافت کے مدعی ہو کر خروج نہ کر بیٹھیں۔ شہزادہ وغیرہ نے اسے بتایا کہ اگر زین العابدین نے بیعت لی، تو عربی، عجمی، کالے اور گورے سب ہی اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے۔

عبدالملک اس معاملہ میں بڑا محتاط واقع ہوا تھا۔ فوراً مدینہ حکم بھیجا کہ زین العابدین کو پابہ زنجیر دمشق روانہ کر دیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ زین العابدین اس حالت میں مدینہ سے روانہ ہوئے کہ ان کے پاؤں میں زنجیر، ہاتھوں میں ہتھکڑی اور گلے میں بھاری

آہنی طوق پہنایا گیا تھا۔ اسی حالت میں زین العابدین دربارِ خلافت میں پہنچے۔ لیکن نہ عبدالملک نے کچھ پوچھا، اور نہ زین العابدین کچھ بولے، وہ اس پژمردہ شاخ کی مانند ہو رہے تھے جس کو بادِ سموم کے تھپیڑوں نے جھلس کر رکھ دیا ہو۔ لیکن وہ ان تمام حالات میں بھی عبادت و مناجات میں مشغول رہے۔ محویت کا یہ عالم تھا گویا نہ پاؤں میں بیڑی ہے، نہ ہاتھوں اور گلے میں ہتھکڑی اور طوق ہے۔ عبدالملک نے ان کو اس حالت میں دیکھا تو اس پر ہیبت طاری ہو گئی۔ اس نے درباریوں کو مشورہ کے لیے طلب کیا۔ محمد بن مسلم زہری دربار میں حاضر تھے، عبدالملک سے عرض کی، کہ علی بن حسین کا کوئی ایسا موقف نہیں جس کی وجہ سے آپ اُن کے خلاف بدگمانی کو دل میں جگہ دیں۔ وہ عبادتِ الٰہی میں اس قدر محو ہیں کہ ان کو اپنا بھی ہوش نہیں ہے، عبدالملک نے یہ مشورہ قبول کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا، اور کہا، "ٹھیک کہتے ہو، واقعی ان کی محویت کا یہی عالم ہے" الغرض زین العابدین کی رہائی کے احکامات جاری ہو گئے اور پورے احترام و اعزاز کے ساتھ وہ مدینہ واپس کر (۲۴) دیئے گئے۔

فرزدق نے ہشام کی ہجو میں جو اشعار کہے، وہ ہشام کو بھی معلوم ہوئے وہ ڈرا کہیں مزید اُن پر اضافہ نہ ہو جائے۔ اس نے معافی کے احکام صادر کرتے ہوئے رہائی کا حکم دیا۔ فرزدق نے زین العابدین کی شان میں جو قصیدہ کہا تھا۔ حاجیوں کی زبانی مشرق و مغرب کے تمام اسلامی شہروں میں مشہور ہو گیا۔ لوگوں نے یاد کیا اور زمانہ کے کانوں نے سنا اور ایک عرصہ تک لوگوں کی اولاد در اولاد زمانہ بزمانہ پڑھا جاتا رہا۔

گو فرزدق نے اپنے وجدان و شعور کو ان اشعار میں سمو دیا ہے، لیکن لوگ کہہ رہے تھے، علی بن حسین کی اس مدح کے صلہ میں خداوند تعالیٰ فرزدق (۲۵) کو بخش دے گا۔

طاعون قیتیات میں[۲۶] ولید بن عبدالملک، اپنے باپ کی وفات پاجانے کے بعد سر براہ خلافت ہو چکا تھا، ولید نے اپنی خلافت کے زمانہ میں یہ پالیسی مقرر کی کہ مدینہ کے باشندوں کو راضی کیا جائے خصوصاً زین العابدین اور تمام اہل بیت کو ہشام مخزومی کے ظلم و استبداد سے نجات دلائی جائے۔ چنانچہ اس کو معزول کرتے ہوئے قریش کے ایک نوجوان امیر زادہ عمر بن عبدالعزیز کو مدینہ کا والی مقرر کیا جن کی عمر اس وقت ۲۵ سال تھی۔ ہشام مخزومی کے بارے میں یہ حکم بھی پہنچا کہ اس کو بر سر عام کھڑا کر دیا جائے کہ اس کے ہاتھوں جس کو جس قدر تکلیف پہنچی ہو، وہ آ کر اپنا بدلہ لے لے۔

ہشام مخزومی کو ولید کے حکم کے مطابق مروان بن حکم کے مکان کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ اعلان میں کہا گیا تھا کہ ہر شخص گالی کا بدلہ گالی سے، لعنت کا لعنت سے اور طمانچہ کا طمانچہ سے لے سکتا ہے، چنانچہ لوگ گالیاں دیتے اور لعنت کرتے ہوئے گزرنے لگے۔ مدینہ میں اب کوئی شخص باقی نہ رہا تھا، قریب قریب سب نے گالیوں اور لعنت کا اپنا بدلہ لے لیا تھا۔

ہشام کو اہل بیت اور خصوصاً زین العابدین سے بہت خوف تھا کیونکہ سب سے زیادہ ان ہی لوگوں کو اس نے ستایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ زین العابدین اس کو قتل کر ڈالیں گے، اگر وہ خود قتل نہ کریں گے تو ان کا کوئی موالی ضرور قتل کر دے گا۔ لیکن ہشام کے پاس اہل بیت یا موالی میں سے کوئی اب تک نہیں آیا تھا، لہٰذا اس کو سخت دھڑکن لگی ہوئی تھی اور وہ ایک بلائے ناگہانی کا منتظر تھا۔

دن ڈھل چکا تھا، شام کی زردی ہر طرف بکھری ہوئی تھی کہ زین العابدین اپنے اہل بیت

اور موالی کے ساتھ آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ہشام کا دل بہت مضطرب تھا۔ اس کو اپنی موت قریب آتی نظر آرہی تھی۔ زین العابدین پہنچے تو اس نے اپنی گردن جھکا دی۔

زین العابدین نے فرمایا،

"اسلام علیک یا ہشام!" اپنے ہاتھ انھوں نے مصافحہ کے لئے آگے بڑھائے اور اس کی کمر کو تھپکا۔ ہشام نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور خود کو سپرد کرتے ہوئے سر جھکا کر رونے لگا۔

زین العابدین نے فرمایا، "اگر تمھیں کوئی حاجت درپیش ہو تو بتاؤ میں پوری کروں اور اگر سرکاری قرضہ ہو تو میں وہ بھی ادا کرنے کو تیار ہوں" ہشام یہ سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، وہ کہہ رہا تھا،

"اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ،" خدا ان بہترین مواقع کو خوب سمجھتا ہے جن کو وہ پیغمبری کے لائق سمجھتا ہے۔

زین العابدین چلے گئے ان کے ہمراہ ان کے مصاحب اور اہل بیت بھی چلے گئے۔ کسی نے بھی ہشام کو کسی بات کے ذریعہ کوئی تکلیف نہیں دی کیونکہ ان کو زین العابدین نے پہلے ہی روک دیا تھا اور فرمایا تھا، "وہ بے قوت ہے معزول شدہ آدمی ہے ضعیف لوگوں کے دل کو ستانا اچھی بات نہیں"۔ اہل بیت کے رکنے سے تمام اہل شہر نے بھی ہشام ابن اسمٰعیل مخزومی کو اس کے بعد کچھ نہیں کہا۔ (۲۷)

---

(۱) المعارف، صفحہ ۱۵۵

(۲) قصص العرب جلد ا صفحہ ۲۵ ا

(۳) تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۲۵

(۴) تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۴۳ و شذرات الذہب جلد ۱ صفحہ ۸۲

(۵) الصحیفۃ الخامسہ، صفحہ ۲۹۴، ۳۳۰

(۶) النجوم الزہرہ، جلد ۱ صفحہ ۲۰۵

(۷) قصص العرب، جلد ۳، صفحہ ۶۲

(۸) طبری جلد ۵، صفحہ ۲۱۷

(۹) اعیان الشیعہ، جلد ۴، صفحہ ۶۰۴

(۱۰) " " "۶" " ۴۷۰

(۱۱) طبقات الشافعیہ، جلد ۱

(۱۲) شذرات الذہب، جلد ۱ صفحہ ۱۶۴

(۱۳) الاغانی، جلد ۱۹، صفحہ ۴

(۱۴) زہر الآداب، جلد ۱، صفحہ ۱۰۲

(۱۵) شذرات الذہب، جلد ۱، صفحہ ۱۴۳

(۱۶) دائرۃ المعارف للبستانی جلد ۹، صفحہ ۳۵۶

(۱۷) زہر الآداب، جلد ۱، صفحہ ۱۰۳

(۱۸) وفیات الاعیان جلد ۳، صفحہ ۱۴۲

(۱۹) الاغانی، جلد ۱۹، صفحہ ۴۰

(۲۰) شذرات الذہب، جلد ۱ صفحہ ۱۴۴

(۲۱) معجم البلدان، جلد ۹، صفحہ ۴۱۷

(۲۲) الاغانی جلد ۱۹، صفحہ ۴۱

(۲۳) اعیان الشیعہ، جلد۴، صفحہ ۴۷۸

(۲۴) طبقات الشعرانی، جلد۱، صفحہ ۳۱

(۲۵) وفیات الاعیان، جلد۳، صفحہ ۱۴۲

(۲۶) اس کو مورخین نے طاعون فتیات اس لئے کہا ہے کہ یہ طاعون اولاً عورتوں میں شروع ہوا تھا۔ تاریخ الخلفاء، صفحہ ۱۴۴

(۲۷) اعیان الشیعہ، جلد۴، صفحہ ۴۴۷

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مدینہ کی گلیوں میں منادی پکار رہا تھا کہ "علی بن حسین کے یہاں کھانے کی دعوت ہے، دعوت عام ہے۔ رشتہ داروں، دوستوں، غریبوں اور مسکینوں سب کو مدعو کیا جاتا ہے۔ دستر خوان پر ہر شخص بلا روک ٹوک پہنچ سکتا ہے۔ ہر شخص کے لیئے علی کے دروازے کھلے ہیں۔ کھانے کی تیاری میں علی بذاتِ خود لوگوں کا استقبال کریں گے۔ ان کے موالی کھانا پکانے میں مشغول ہیں۔"

جب کھانے کا وقت ہو جاتا تو اہل مدینہ اور مسافروں میں سے جس کا جی چاہتا پہنچ جاتا، لیکن علی بن حسین نے محسوس کیا کہ بہت سے فقرائے مدینہ جن کو وہ بذاتِ خود جانتے پہچانتے تھے دستر خوان پر حاضر نہیں ہوئے لہٰذا صورتِ حال یہ قرار دی کہ علی نے کھانے کے دو حصّے کئے ایک حصّہ وہ خود کھاتے اور مہمانوں کو کھلاتے اور دوسرا حصہ لے کر ان لوگوں کے گھروں پر حاضر ہوتے، اور انھیں اختیار دیتے کہ خواہ وہ کھانا لے لیں اور خواہ مال لے لیں۔

علی بن حسین نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ نہ وہ دستر خوان پر آئے اور نہ انھوں نے کوئی چیز لی۔ انھوں نے اپنی عزت کو عفت و ناموس کے پردے میں چھپانے اور شکموں کو بھوکا رکھنے کی کوشش کی ہے۔ علی بن حسین نے اب ایک تیسرا حصہ اور علیحدہ کیا۔ کچھ کھانا اور کچھ مال لے کر (وہ رات کی تاریکیوں میں چادر اوڑھ کر نکلتے۔ لوگوں کے دروازوں پر پہنچتے، ایک ہاتھ میں درہم و دینار کا تھیلا ہوتا اور کمر پر کھانے کی بوری ہوتی

دروازے کھٹکھٹاتے اور اس طرح ان لوگوں کو کھانا اور مال دیتے کہ نہ وہ ان کو پہچان سکتے اور نہ یہ پوچھ پاتے کہ آپ کون ہیں ؟ مدینہ میں اس پوشیدہ خیرات کا چرچا ہونے لگا۔ بسا اوقات یہ بھی ہوا کہ زین العابدین کے اہل بیت اور دوست، احباب زین العابدین کا شکوہ کرتے کہ وہ ہماری مدد نہیں کرتے۔ البتہ رات کو کوئی صاحب دل چھپ کر آتا، اور ہماری مدد کرتا ہے۔ زین العابدین ان کی ان مذمتوں کو اپنے کانوں سے سنتے لیکن خاموش رہتے۔ وہ اس راز کو ظاہر کرنا پسند نہ کرتے تھے کہ وہ شخص میں ہی ہوں تاکہ اس طرح ثواب اجر برباد نہ ہو اور لوگوں کی مذمتوں کی وجہ سے جو ان کو ثواب ہو رہا ہے وہ اس (۱) سے محروم نہ رہیں)

علی بن حسین ایک رات میں مستورالحال غریبوں کے تقریباً سو دروازے کھٹکھٹاتے، ان کی کمر پر کھانے کی بوری ہوتی (۲) وہ اپنے ہمراہ غلاموں یا کنیزوں کو نہ لے جاتے تھے، کیوں کہ اس طرح لوگوں کی پاک دامنی اور عزت نفس پر حرف آتا تھا۔

جود وکرم کا یہ جذبہ اس قدر مخلصانہ ہوتا تھا کہ اگر ان لوگوں پر کام نبانیا گیا ہوتا یا وہ مدینہ سے باہر دوسرے شہروں میں ہوتے تو وہ اس وقت بھی اپنی کمر پر اٹھا کر لوگوں کو کھانا پہنچانے میں کوئی دریغ نہ کرتے اور کوشش یہی ہوتی کہ لوگوں کو معلوم نہ ہو۔

حسب معمول ایک روز کھانے کا دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ ہر قسم کے لوگ کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ زین العابدین سب کی میزبانی اور پوری پوری رعایت کر رہے تھے وہ اگر کسی شخص کو دیکھتے کہ اس کو کھانے میں کچھ شرم وحیا مانع ہے تو اس کا حوصلہ بڑھاتے اور بے تکلف کھانے کی ترغیب دیتے، اگر کوئی مریض نظر آتا تو اپنے ہاتھ سے روٹی کے

ٹکڑے توڑتے ہوئے لقمے بنابنا کر اس کے منہ میں دیتے۔ ایسا کرنے میں کوئی حجاب یا تکلف محسوس نہ کرتے۔ لوگ کھانا کھا رہے تھے اور زین العابدین جدھر جاتے اُدھر ہی ان کی نگاہیں گھوم جاتیں۔

غرض مہمانی کا بازار گرم تھا کہ کسی بلند آواز میں پکارنے والے نے منادی کی: "اے خاندانِ نبوت کے مقتدا، رسالت کے مخزن، وحی و ملائکہ کے گھرانے کے سرتاج! میں مختار ثقفی کا ایلچی ہوں اور عبید اللہ بن زیاد کا سر لے کر حاضر ہوا ہوں۔"

لوگوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ بنی ہاشم کی عورتیں چلمنوں کی طرف دوڑ پڑیں۔ ایلچی اس شان سے داخل ہوا کہ نیزہ پر سر اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ جس وقت زین العابدین کے سامنے آیا تو یہ سر اس نے ان کے قدموں میں رکھ دیا۔ زین العابدین نے آنکھیں بند کر لیں اور فرمایا، "اس مکروہ سر کو میرے سامنے سے دور کر دو۔" پھر وہ مسکرائے اور ہنس پڑے۔ جب سے ان کے والد شہید ہوئے تھے، ان کو کبھی بھی ہنستے ہوئے نہ دیکھا گیا تھا۔ مگر آج کا دن اس سے مستثنیٰ تھا!

اس سے پیشتر حال یہ تھا کہ کھانے کا وقت آیا تو عام لوگوں کے لیے دروازے مہمانی کے لئے وا کر دیئے جاتے۔ کھانا ان کے لیے لایا جاتا مگر ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے۔ ایک روز ایک مولیٰ نے کہا۔ "اے ابنِ رسول! کیا آپ کے غم ناک دور کے خاتمے کا وقت نہیں آگیا؟" فرمایا! "کیسی باتیں کرتے ہو۔ یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے، ان میں سے ایک گم ہو گیا تو اس کی جدائی میں روتے روتے انکی آنکھیں سپید پڑ گئیں۔ حالانکہ ان کو یقین تھا کہ یوسف اسی عالم میں زندہ ہیں۔ مگر میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے باپ، بھائی، چچا اور خاندان کے سترہ آدمیوں کے علاوہ

باپ کے انصار میں سے بیسیوں کو اپنے اردگرد تہ تیغ ہوتے دیکھا ہے۔ میرا غم کیسے ختم ہو جائے گا۔" (۳)

زین العابدین کی یہ ہنسی خوشی کی ہنسی نہ تھی کیونکہ ان کی مسرتیں ان سے چھن چکی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو اپنے والد کا وہ وقت یاد آیا جس وقت وہ ان کو بیماری کی حالت میں دل بہلانے کے لیے فرما رہے تھے، "بیٹا کس چیز کو جی چاہتا ہے؟ ہمیں بتاؤ۔" لیکن بیٹے کا نہ کسی چیز کو جی چاہا تھا اور نہ کوئی چیز انھوں نے مانگی تھی، البتہ ایک خواہش ضرور دل میں کروٹیں لے رہی تھی۔ انھوں نے اللہ سے دعا مانگی تھی، کاش ایک وقت وہ بھی کھانا کھاتے ہوں اور قاتلوں کا سر ان کے قدموں میں پڑا ہوا ہو۔ خداوند تعالے نے ان کی یہ دعا عبیداللہ بن زیاد کے حق میں قبول کر لی تھی۔

اسی روز ملکِ شام سے پھلوں میں لدے ہوئے علی بن حسین کے کچھ اونٹ آئے۔ ابن زیاد کے مقتول ہو کر لائے جانے سے پیشتر ان اونٹوں کے آنے کی خبر علی ابن حسین کو پہلے ہی مل چکی تھی۔ مقتول کا سر پیش ہونے کے بعد تجارتی کارندوں سے فرمایا، "جاؤ ان پھلوں کو اہلِ مدینہ میں تقسیم کر دو، اور ہر دروازے پر دستک دے کر پہنچا دو۔" (۴)

علی بن حسین صرف مستور الحال لوگوں کے دروازوں پر ہی اپنے صدقات لے کر نہیں جاتے تھے، بلکہ وہ مریضوں کے پاس بھی عطایا اور ہدایا لے کر پہنچتے تھے۔ حضرات صحابہ اور مہاجرین و انصار کی اولاد کو خصوصیت سے یاد رکھتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ سابقین میں سے تھے، اس لیے فضل و احسان کے بھی مزید مستحق تھے۔ انھیں ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ محمد بن اسامہ بن زید سخت بیمار ہیں۔ وہ فوراً ان کی عیادت کو پہنچے، دیکھا کہ آخری وقت ہے، اور وہ رو رہے ہیں۔

زین العابدین نے فرمایا، "کیا حال ہے، کیا موت سے گھبرا رہے ہو؟"
محمد بن اسامہ نے جواب دیا، "زین العابدین! مجھ پر قرض بہت ہے اور گھر والے تنگی میں مبتلا ہیں، ڈرتا ہوں کہ اگر مر گیا تو یہ قرض کیسے ادا ہوگا؟"
زین العابدین نے پوچھا، "قرض کس قدر ہے؟" کہا، "پندرہ ہزار دینار"۔ علی نے فرمایا، "ابن اسامہ! کوئی فکر نہ کرو، قرض میں ادا کر دونگا، نیز امید ہے کہ تم کو آرام (۵) نصیب ہو جائے گا۔"
اس کے بعد محمد بن اسامہ کی وفات ہوگئی اور زین العابدین نے ان کا تمام قرض ادا کر دیا۔

زمانہ کے ساتھ ساتھ لوگوں کے حالات بدل چکے تھے۔ ظاہر و باطن کے دو مختلف چہرے تھے۔ لوگ بنو امیہ کے پاس جاتے تو بنی ہاشم کی برائیاں کرتے اور بنی ہاشم کے پاس باریابی ہوتی تو بنی امیہ کی رسوائیاں گناتے۔ دورِ نفاق میں لوگوں نے دو رخی کو اپنا لیا تھا۔ علی بن حسین لوگوں کی اس مذموم عادت سے ناواقف نہ تھے۔ بدلتے ہوئے حالات کا دھارا اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ غالباً لوگوں کی اس دو رخی کو کبھی نہ پنپنے دیتے۔ لیکن وقت کا بہاؤ اس تیزی سے دوسری سمت جا رہا تھا کہ وہ کچھ بھی نہ کر سکتے تھے، بجز اس کے کہ انھوں نے لوگوں کی نفاق آمیز باتوں سے اپنے کانوں کو بہرا بنا لیا تھا۔
ایک روز ان کی خدمت میں کچھ لوگ اسی قسم کے حاضر ہوئے۔ دورانِ گفتگو میں صحابۂ رسولؐ پر چھینٹے پھینک رہے تھے۔ تمام باتیں اس قسم کی تھیں کہ خواہ مخواہ سننے والے کو ان حضرات کی طرف سے بدگمانی پیدا ہو۔ زین العابدین نے ان لوگوں کی اس بکواس کو زیادہ آگے نہ چلنے دیا، بلکہ ان کی گفتگو بیچ میں سے قطع کرتے ہوئے فرمایا، "اچھا ایک بات بتلاؤ گے؟"

کہنے لگے، "وہ کیا بات ہے ؟"

فرمایا، "کیا تم ان مہاجرین اولین میں سے ہو، جن کے متعلق اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ ان کے مال چھنے، گھر لٹا، لیکن انھوں نے اللہ کی خوشنودی و مہربانی کی طلب میں سب کچھ گوارا کر لیا اور وہ اللہ اور رسول کے لیے اپنا وطن چھوڑنے پر راضی ہو گئے ؟"

کہنے لگے، "نہیں۔"

فرمایا، "اچھا ان لوگوں میں سے ہو جن کے متعلق فرمایا ہے کہ انصار وہ خدا دوست جماعت ہے جس نے ایمان کو اپنے دلوں میں بسایا، مہاجرین کے ساتھ نیک سلوک سے پیش آئے ہیں، اپنے مال خرچ کرنے میں ان کو کوئی کوفت محسوس نہیں ہوتی، بلکہ مہاجرین کو تنگدستی کی حالت میں بھی انھوں نے اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھا ۔؟"

کہنے لگے، "نہیں۔"

زین العابدین نے فرمایا، "اپنے اقرار کے مطابق گویا تم ان دونوں فریقوں سے نہیں ہو، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تم ان لوگوں میں سے بھی نہیں ہو، جن کے متعلق اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے، مہاجرین و انصار کے بعد ہمیں وہ لوگ بھی پسند ہیں جو ان کے بعد آئے۔ وہ یہ دعا مانگتے ہیں کہ "الٰہی ہمارے اور ہمارے ان بھائیوں کی مغفرت فرما جو ہم سے ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے رخصت ہو چکے۔ ہمارے دلوں میں مومنوں کی طرف سے کینہ پیدا نہ کر۔" خدا تمھیں سمجھے، جاؤ، یہاں سے نکل (۶) جاؤ۔"

زین العابدین کا یہ عتاب منافقوں پر بجلی بن کر گرا، وہ وہاں سے بلبلاتے اور شرماتے ہوئے باہر نکل گئے، لیکن اس کے بعد کبھی کسی کو اصحاب رسولؐ کی شان میں کوئی نامناسب بات منہ سے نکالنے کی جرأت نہ ہوئی۔

اجتماعی ماحول کے متعلق علی بن حسین کی یہ پختہ رائے تھی کہ لوگوں کو فضائلِ اخلاق کی طرف زور اور تسلط سے نہیں موڑا جا سکتا، بلکہ اس کا موثر طریقہ محبت و دلجوئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگوں کے معاملات اور ان کے افکار کی روش کے لئے کچھ اساسی اصول کی وضع و تدوین کی فکر میں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلامی معاشرہ مجموعی طور پر اخلاقی قدروں میں بھی مضبوط ہو۔ وہ یہ ہرگز پسند نہ کرتے تھے کہ اس اصول کو جوش و غضب و انتہا پسندی کا جامہ پہنایا جائے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اخلاق و انسانیت کا احترام مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں اگر اخلاقی بلندی کے بجائے زور اور جبر سے کام لیا گیا تو وہ اسلام کی صحیح ترجمانی نہ ہوگی۔ وہ شب و روز خدا کے حضور میں ان حالات کی درستی کے لئے دست بدعا تھے۔

وہ اپنے اردگرد کے انسانوں اور وقت کی تبدیلی کو دیکھ رہے تھے کہ اجتماعی معاشرہ کی بندشیں ڈھیلی ہو چکی ہیں۔ چنانچہ اولاً علی بن حسین نے اہلِ قلم اور پڑھے لکھے غلاموں کو وہ حقوق لکھوائے جن کو اسلام اپنی تعلیمات میں جگہ دیتا ہے۔ یہ وہ حقوق تھے جن کو اسلام ماضی قریب میں انسانوں کی ہدایت کے لئے لے کر آیا تھا۔ لیکن ذہن و ضمیر میں ان کی قدر و قیمت نہ رہنے کی وجہ سے اب ان کی بربادی کا وقت آگیا تھا!

علی بن حسین کے خیال میں حریت کا مفہوم یہ نہ تھا کہ معاشرہ حرص و ہوس کی نذر ہو کر ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہو جائے۔ بلکہ حریت یہ تھی کہ اخلاقِ فاضلہ میں اس قدر بلندی پیدا ہو کہ تمام حقوق پورے ہوں۔ معاشرہ کو فرائضِ انسانی کا ہر وقت خیال رہے۔ باہمی روابط میں استحکام ہو، وہ روابط جو ہر چہار طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ انسان اور اس کے خالق کے درمیان، حاکم و رعایا کے درمیان، استاد و شاگرد کے درمیان، بیوی خاوند کے درمیان، باپ، بھائی اور اولاد کے درمیان، آقا و غلام کے درمیان، انسان اور اس کے بھائی

دوسرے انسان کے درمیان، انسان اور خود اس کی ذات کے درمیان، اس کے طبعی میلان و عقل کے درمیان، حتیٰ کہ جسمانی اعضا کے درمیان، غرض تمام امور میں کچھ ایسے قومی روابط ہیں جن کے متعلق اسلام نے کچھ فرائض عائد کئے ہیں اور ان کا بجالانا نہایت ضروری ہے۔

یہ وہی حقوق ہیں جو ایک دوست کے دوست پر، مسافر کے اپنے رفیق سفر پر، ایک پڑوسی کے دوسرے پڑوسی پر، ایک مالی یا تجارتی شریک کے دوسرے شریک پر، قرض خواہ کے قرض دار پر، مدعی کے مدعیٰ علیہ پر، ناصح مشفق کے اپنے مخاطب پر، بڑے کے چھوٹے، اور چھوٹے کے بڑے پر، سائل کے مسئول پر، اہل اسلام کے ذمیوں پر، حتیٰ کہ خود انسان کی اپنی ذات پر، عائد (۷) ہوتے ہیں۔

امام سجاد زین العابدین نے دیکھا کہ لوگ عبادت الٰہی میں مختلف الخیال ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جو خدا کی عبادت اس کے خوف و ہیبت سے مجبور ہو کر کرتے ہیں۔ لیکن یہ تخیل ان کو پسند نہ آیا۔ کیونکہ یہ غلامانہ بندگی تھی کہ جس میں نیکی کا تصور خوف و دہشت پر مبنی تھا۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا گروہ ان عبادت گزاروں کا دیکھا جو رغبت اور لالچ سے اللہ کی بندگی کرتے ہیں۔ اس گروہ کی طرف انتساب کو بھی پسند نہ کیا، کیونکہ یہ ایک قسم کی تاجرانہ عبادت تھی کہ جس میں نیکی کا تصور محض لالچ کے خیال پر مبنی تھا۔ انھوں نے ان عابدوں کے تخیل کو بہت بلند پایا جو اللہ کی عبادت صرف شکر و حمد کے لئے کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ تخیل قابلِ داد اور لائق عمل تھا کیونکہ یہ خالصتاً احرار کی (۸) عبادت تھی۔

چنانچہ علی بن حسین نے عبادت الٰہی کی بنیاد شکر و حمد پر رکھی، وہ اس میں اس قدر اخلاص کیش تھے کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز ان کے نزدیک گرویدگی کا باعث نہ تھی۔ وہ ایک

متوجہ نماز میں مشغول تھے، زلزلہ آیا اور ختم ہو گیا لیکن نہ وہ اس سے متاثر ہوئے اور نہ اس کو محسوس کیا۔ اسی طرح ایک مرتبہ نماز پڑھ رہے تھے کہ گھر میں آگ لگی اور ہر چہار طرف پھیل گئی۔ گھر والے چیخ چیخ کر ان کو باہر نکل جانے کو بلا رہے تھے، لیکن وہ سجدے سے نہ اٹھے اور باطمینان نماز پوری کی، اس عرصہ میں لوگوں نے آگ پر قابو پا کر اس کو بجھا دیا تھا۔

گھر والوں نے کہا، "آپ نے ہماری آوازوں کی طرف کوئی توجہ نہ کی، حالانکہ آگ تمام گھر میں بھڑک اٹھی تھی؟" فرمایا، "مجھے ایک دوسری آگ کے خیال نے اس طرف سے غافل کر(۹) رکھا تھا۔"

علی بن حسین کا ایک ایک دن عبادت و خلوت نشینی میں اضافہ کے ساتھ گزر رہا تھا۔ عبادت سے فارغ ہونے کے بعد وہ انتہائی نڈھال اور کمزور ہو جاتے۔ ان کے قویٰ میں یہ ضعف و انحطاط روز افزوں تھا۔ ایک روز ان کے صاحبزادہ محمدؐ نے ان کی یہ کیفیت محسوس کی۔ عرض کیا، "ابا جان! مجھے وصیت فرمائیے۔"

آپ نے فرمایا، "پانچ قسم کے آدمیوں کی ہم نشینی، گفتگو اور رفاقت سے احتراز کرنا۔"

صاحبزادہ:۔ ابا جان! وہ کون پانچ شخص ہیں؟

علی بن حسین:۔ فاسق سے بچو، وہ تمہیں ہوس کار بنا ڈالے گا۔

"ابا جان! ہوس کاری سے کیا مراد ہے؟"

"ہوس کاری سے یہ مراد ہے کہ انسان لاحاصل چیزوں کی طمع کرنے لگے۔"

"ابا جان! دوسرا کون شخص ہے؟"

"بخیل شخص کی دوستی سے اجتناب کرنا، کیوں کہ ایک ایسے وقت

میں جب کہ تم کو مال کی شدید ترین ضرورت ہو رہی ہو گی، وہ محض اپنے مال کی خاطر تم سے بے تعلق ہو جائے گا۔"

:۔ "ابا جان! تیسرا کون شخص ہے؟"

:۔ "جھوٹے آدمی کو کبھی دوست نہ بنانا۔ وہ ایک سراب ہوتا ہے۔ وہ تم سے عزیزوں کو بیگانہ اور بیگانوں کو عزیز کر دے گا۔"

:۔ "ابا جان! چوتھا کون شخص ہے؟"

:۔ "احمق کو کبھی دوست نہ بنانا۔ وہ دوستی میں تم کو فائدہ پہنچانا چاہے گا، لیکن حقیقت میں تم پر ظلم کرے گا۔"

:۔ "ابا جان! پانچواں شخص بھی بتلایئے!"

:۔ "قطع رحمی کرنے والے انسان سے کبھی تعلق نہ رکھنا۔ کیونکہ میں نے کتاب الٰہی میں ایسے شخص کو تین جگہ ملعون پایا۔" (۱۰) چونکہ صاحبزادہ وہ تین مواقع جانتے تھے، اس لئے تشریح نہیں چاہی۔

اسلامی فوجیں مشرق و مغرب میں فتح و کامرانی کی منزلیں طے کرتی اور دشمنوں کے قلعوں اور چھاؤنیوں کو زیر و زبر کرتی آگے بڑھ رہی تھیں، خدائے شر (اہرمن) بحالِ تباہ ان کے آگے آگے بھاگ رہا تھا۔ خدا کی مخلوق کو اس کی پرستش سے خلاصی اور دلوں کو اطمینان کی سانس لینے کی فضا نصیب ہو رہی تھی۔ وہ اب اپنے آپ کو عدل و خیر کے مالک، اللہ رب العزت کے سامنے دعا و شکر میں مشغولِ سجدہ ریز پا رہی تھی۔

عرب فوجیں مشرق میں ہند و سندھ کی سرحدوں کو عبور کر چکی تھیں۔ دوسری طرف

چین کی دیواروں کے مضبوط دروازوں پر دستک دی جارہی تھی۔ اگر کسی قلعہ کے محاصرہ میں طول کھنچتا تو فوج کا ایک مضبوط دستہ اس محاصرہ پر چھوڑ کر باقی فوج آزادی کا پرچم لہراتی ہوئی آگے بڑھ جاتی۔ حتیٰ کہ اُن قلعہ کے پناہ گیروں کی سانسیں گھٹنے لگتیں وہ ان قلعوں کی دیواروں کو چھوڑ کر فتح کر لیتے۔

اسی ذیل میں پہلی فتح کے موقعہ پر مشرقی فوج کابل کے اُن بعض قلعوں کو بھی فوجی دستوں کے حوالہ کر کے آگے بڑھ گئی تھی جن کی دیواریں ناقابلِ فتح یا ناقابلِ شکست نظر آتی تھیں۔

زین العابدین سے عرض کیا گیا "قلعوں کا محاصرہ کرنے والے فوجی دستوں اور اسلامی فوج کے لئے دعا فرمایئے کہ اللہ تعالےٰ ان کو کامیاب کرے۔" ان کہنے والوں کی نظروں میں یہ حقیقت بھی تھی کہ یہ دستے اور فوج، بنی امیہ کی حکومت کے لشکر سے تعلق رکھتے ہیں لیکن علی بن حسین کی منظر میں یہ صرف اسلامی لشکر تھا جس کی کامیاب قیادت کا سہرا بڑے بڑے صحابہ کی اولاد کے سر تھا۔ اس سلسلہ میں وہ اس قدر صاف دل تھے کہ اگر بالفرض یہ بنی امیہ ہی کی فوج ہوتی تو وہ اس وقت بھی اس کو رشک و حسد سے یاد نہ کرتے، کیونکہ بہر حال اس فوج کا مقصد اعلائے دین الٰہی تھا۔

زین العابدین نے اس فوج اور محاصر دستوں کے لئے دعا کرتے ہوئے فرمایا،

"اے اللہ ان کے ہتھیاروں کو تیز کر دے۔ ان کی حفاظت فرما۔ ان کی طاقت ناقابلِ تسخیر کر، اس جماعت میں باہمی محبت دے اور تمام امور انجام بخیر کر۔ ....

"اے پروردگار! نصرت و صبر کے ساتھ ان کے بازوؤں میں طاقت دے اور اپنی بہترین تدبیریں ان کے شاملِ حال کر ....

"اے اللہ دشمنوں سے مقابلہ کے وقت پُر فریب دنیا کا تصور ان کے دماغوں سے

نکال دے۔ پُرفتن دولت کے وسوسے ان کے دلوں سے محو ہو جائیں۔ ان کی نظر وں کے سامنے صرف جنت ہو۔ ان میں سے نہ کوئی راہِ فرار سوچے اور نہ پیٹھ دکھلانے کا ارادہ کرے!" عرض کی گئی، "زین العابدین دشمن کے لئے بھی شر و شکست میں مبتلا ہونے کی دعا کیجئے۔" فرمایا:۔

"اے اللہ دشمنوں کا عروج خاک میں مل جائے وہ قلیل و ذلیل ہو جائیں۔"

کسی نے عرض کی "کیا آپ بنی امیہ کی فوج کے لئے دعا کر رہے ہیں؟" فرمایا:۔

"اے اللہ! ان میں سے جو غازی بھی تیری ملت سے ہو اور سنت کی پیروی کرتا ہو۔ تاکہ تیرا دین قوی اور تیری جماعت قوی ترین ہو تو اس کو آسانی اور تمام امور میں بھلائی نصیب کر، اس کو کامیاب کر، عافیت و سلامتی کے ساتھ واپس لا اور امن و عافیت کو اس کا ساتھی (۱۱) بنا!"

سنہ ۹۴ھ شروع ہے۔ زین العابدین ۵۰ سال کی عمر کے لگ بھگ ہیں، مشرق و مغرب سے اسلامی فوجوں کی فتح و کامرانی کی پر تہنیت خوش خبری دم بدم پہنچ رہی ہے، ان بشارتوں میں یہ خوشخبری بھی ہے کہ پیچھے چھوٹے ہوئے قلعے بھی سلامتی کیساتھ فتح ہو چکے ہیں۔ یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ بعض قلعوں کی فتح کا سہرا چند قریب البلوغ عرب بچوں کے سر ہے۔ جنہوں نے قلعوں کی دیواروں پر چڑھ کر ان کے دروازے کھول ڈالے اور ساتھ ہی اپنی جان، جانِ آفرین کو سپرد کر دی۔

امام سجاد کی زندگی کا چراغ ٹمٹا کر بجھا چاہتا ہے کہ قاصد نے آکر خبر دی "کابل کا آخری قلعہ بھی فتح ہو (۱۲) گیا۔" زین العابدین کے بجھتے بجھتے ہونٹوں پر حزن و مسرت

میں جلی جلی کیفیت کے ساتھ مسکراہٹ کھیلتی ہے۔ ان کو یاد آجاتا ہے کہ وہ ماں "شہربانو" جس کو انھوں نے نہیں دیکھا وہ عرب و عجم میں تعلق کا سنگ میل ثابت ہوئی۔ کابل کے آخری قلعہ کی فتح عرب و فارس کے باہمی ارتباط و تعلق کا اعلان تھا اور خدائے خیر و عدل، خدائے واحد جس نے تمام انسانوں کو مساوات کے ساتھ پیدا کیا تھا، وہ تمام انسانوں کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کر چکا تھا۔

---

(۱) اعیان الشیعہ، جلد ۴، صفحہ ۱۸ و ۴۶۲ ۔ الصفوۃ، جلد ۲، صفحہ ۵۴

(۲) الصفوۃ، جلد ۲، صفحہ ۵۴ ۔ دائرۃ المعارف البستانی، جلد ۹، صفحہ ۳۵۰

(۳) اعیان الشیعہ، جلد ۴، صفحہ ۴۲۵

(۴) تاریخ الیعقوبی، جلد ۳، صفحہ ۶

(۵) اعیان الشیعہ، جلد ۴، صفحہ ۴۶۰ ۔ الصفوۃ، جلد ۲، صفحہ ۵۶۔

(۶) الصفوۃ، جلد ۲، صفحہ ۵۵

(۷) رسالۃ الحقوق فی اعیان الشیعہ، جلد ۴، صفحہ ۵۰۱

(۸) الصفوۃ، جلد ۲، صفحہ ۵۳

(۹) الصفوۃ، جلد ۲، صفحہ ۵۲

(۱۰) " " " " ۵۶

(۱۱) اعیان الشیعہ، جلد ۴، صفحہ ۵۴۲

(۱۲) تاریخ الخلفاء، صفحہ ۱۴۹

کتاب کے ماخذ

الاسلام والحضارۃ العربیہ	کرد علی
الاغانی	ابوالفرج اصفہانی
بدائع الصنائع	ابن مسعود کاشانی
تذکرۃ الحفاظ	ذہبی
تاریخ الخلفاء	سیوطی
تاریخ الخمیس	حسین بن محمد دیار بکری
تاریخ طبری	محمد بن جریر طبری
تاریخ یعقوبی	احمد بن ابی یعقوب
حاضر العالم الاسلامی	اسٹیوڈرڈ، عربی میں ترجمہ از عجاج نویہض
الحقائق	شیخ حبیب آلِ ابراہیم
الحور العین	ابنِ فارس
الخراج	قاضی ابو یوسف شاگرد امام ابو حنیفہ
اخلاق الملوک	جاحظ
دائرۃ المعارف	بستانی

دول الاسلام	ذہبی
زہر الآداب	قیروانی
زینب عقیلۂ بنی ہاشم	مؤلف
شذرات الذہب	ابن عماد
الصحیفۃ الخامسۃ السجادیہ	سید محسن امین
صفوۃ الصفوہ	ابن الجوزی
طبقات الشافعیہ	ابن السبکی
طبقات الکبریٰ	شعرانی
العقد الفرید	ابن عبد ربہ
اعیان الشیعہ	سید محسن امین
عیون الاخبار	دینوری
قصص العرب	جاد مولیٰ
الکامل	مبرد
مختصر تاریخ العرب	سیدیو، ترجمہ از عیتر
مروج الذہب	مسعودی
المعارف	ابن قتیبہ
معجم البلدان	یاقوت حموی
النجوم الزاہرہ	ابن تغری بردی
الوحی المحمدی	سید رشید رضا
وفیات الاعیان	ابن خلکان

زندگی اور عمل۔ از ڈاکٹر ماریڈن ۔ قیمت:۔ ۵۰/۱
روز مرہ زندگی کے مسائل کو عملی طور سے حل کرنے کے آسان راستے۔

غبارِ خاطر۔ از مولانا ابوالکلام آزاد ۔ قیمت:۔ ۳/- (پہلی قیمت -/۶)
قدرت بیان کی بے ساختگی، فکر کے پیمانے کی بلندی، نظر کے معیار کی ارجمندی سے معمور خطوط کا یہ مجموعہ ایک عظیم انسان کی ذہنی زندگی کا روشن ترین عکس ہے۔

تذکرہ۔ از مولانا ابوالکلام آزاد ۔ قیمت: ۳/- (پہلی قیمت -/۷)
باطل کے خلاف حق کی طاقتوں کے زبردست جہاد کا تذکرہ۔ حق کے لئے لڑنے والوں کی ان مثالوں سے پڑھنے والوں کے دل مدتوں گرم رہیں گے۔ یہ مثالیں اندھیرے میں جگنوؤں کی طرح چمکتی رہیں گی۔

حلال و حرام۔ از عطاء اللہ پالوی قیمت:۔ ۲/۲۵
قرآن کے مطابق کھانے پینے اور فنونِ لطیفہ میں کیا حلال اور حرام ہے۔ ایک روشن فکر مصنف کے قلم سے ایک اہم معاشرتی اور دینی مسئلے پر ایک انقلاب آفریں کتاب۔

قلوپطرہ ۔ از آرتھر ویگل قیمت:۔ ۳/-
ملکۂ مصر، ملکہ جلال و جمال قلوپطرہ کی رنگین و سنگین زندگی کا حقیقت آفریں جائزہ۔

معلومات کا انسائیکلوپیڈیا۔ از علی ناصر زیدی پروفیسر پاکستان ملٹری اکیڈمی
آپ کا گھر اب آپ کے ہمسایوں کی نسبت اس لئے بھی افضل سمجھا جائے گا کہ اس میں معلومات کا انسائیکلوپیڈیا جیسی اہم اور مفید کتاب موجود ہوگی۔ معلومات کی صحت اور وسعت سے آپ یقیناً اپنے ماحول میں ممتاز حیثیت حاصل کر سکتے ہیں۔ پانچ سو صفحوں کی اس ضخیم اور بھرپور کتاب کی تیاری میں مرتب نے کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ناشر نے حتی الامکان قیمت کم رکھی ہے۔ ——— قیمت ۳/-

لہریں ——— حماقتیں ——— مزید حماقتیں

قیمت :- ۱/۵۰ ۳/- ۳/-

"اردو کے مشہور و مقبول ترین افسانہ نگار شفیق الرحمٰن کے ہنستے مسکراتے افسانوں اور خاکوں کے یہ تین مجموعے اس بات کا ثبوت ہیں کہ "شفیق الرحمٰن موجودہ دور میں شگفتہ اور صحت مند ادب کا بانی ہے۔"

ماہنامہ۔ ادب لطیف لاہور

سنگ و خشت — شیشہ و تیشہ

۱/۵۰ ۱/۵۰

کنہیا لال کپور کے طنز کے تیروں اور مزاح کی پھلجھڑیوں سے معمور مضامین اور خاکوں کے یہ دو مجموعے ہماری معاشرتی، ادبی اور اخلاقی زندگی کو بے نقاب کرنے میں مثال نہیں رکھتے کپور کے مضامین میں ظرافت ہے۔ زندگی ہے۔ مگھا گہمی ہے۔

میرے بھی صنم خانے ۔ از قرۃ العین حیدر۔ قیمت :- ۳/- (اصلی قیمت -/۶)

قرۃ العین حیدر اردو میں ایک بالکل نئے اسلوب نگارش کی موجد ہیں۔ ان کا یہ ناول اردو کے چند بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے کرداروں کی ذہنی زندگی کی ایسی موثر تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ کہ یہ کردار پڑھنے والوں کے دوستوں کی طرح دل و دماغ میں بس جاتے ہیں اور ان کی یاد اسی طرح دلوں میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے جس طرح دوستوں کی یاد۔

دیوانِ غالب ——— قیمت ۲/۲۵

دیوانِ غالب اردو کی سب سے مقبول کتاب ہے۔ آج بھی اکثر لوگ غالب کو اردو کا سب سے اچھا شاعر سمجھتے ہیں۔ میری لائبریری میں اب اس اردو کے مقبول ترین شاعر کے اردو کلام کے واحد مجموعے دیوانِ غالب کا صحیح ترین نسخہ بے داغ طباعت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

الزہرا ـــــ الحسین ـــــ الہارون

۱|۰ ۱|۵۰ ۲|۲۵

عمر ابوالنصر عربی کا نامور سوانح نگار ہے۔ الزہرا میں خاتون جنت بی بی فاطمہ کی جیتی جاگتی شخصیت اجاگر کی گئی ہے۔ الحسین حضرت امام حسینؓ کے حالات کا سب سے مستند تذکرہ ہے۔ الہارون عظیم ترین مسلمان بادشاہ ہارون الرشید کے دلچسپ ترین واقعات پر مبنی ہے۔ ان تینوں کتابوں میں مصنف نے تاریخ نویسی کا ایک نیا اور برتر معیار قائم کیا ہے۔ ترجمہ شیخ محمد احمد پانی پتی

المامون۔ از علامہ شبلی نعمانی قیمت ۲|۲۵ (پہلی قیمت ۵|)

"شبلی نعمانی نے المامون میں مامون الرشید بن ہارون الرشید کے تمام کارنامے، اچھے یا برے نہایت خوبی اور بے انتہا خوش اسلوبی سے لکھے ہیں۔ انہوں نے دلچسپ واقعات کے ساتھ ساتھ مامون کی پرائیویٹ زندگی، اس کے شغلوں اور محفلوں کا بھی ذکر کیا ہے اور اس زمانے کی زندگی اور معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے۔" سرسید

رابعہ بصری۔ از وداد السکاکینی، ترجمہ عبدالصمد صارم۔ قیمت ۱|۵۰

دنیائے تصوف کی مشہور ہستی رابعہ بصری کے نام سے ہر شخص واقف ہے، اردو ادب میں بھی اس نام کو تلمیحی حیثیت حاصل ہے، لیکن ان کے حالات کا علم ہزار میں سے ایک کو بھی نہیں۔

عمر بن عبدالعزیز۔ از احمد زکی صفوت، ترجمہ عبدالصمد صارم قیمت ۱|۲۵

بنوامیہ کے اس جلیل القدر فرزند کے حالات جس نے خلفائے راشدین کی یاد تازہ کر دی۔

امیر معاویہؓ۔ از انیس زکریا، ترجمہ عبدالصمد صارم قیمت ۱|۲۵

سلطنت بنوامیہ کے بانی، کاتب وحی حضرت امیر معاویہ کی سیاست، فراست اور طرز حکومت کا ایک منصفانہ جائزہ۔

3ک

امام

زین العابدین

علی بن حسینؑ